عصمت چغتائی کی ناول نگاری

شبنم رضوی

عصمت چغتائی کی ناول نگاری

ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں

شبنم رضوی

عِصمت چُغتائی کی ناول نگاری

(ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں)

شبنم رضوی

اشاعت : اوّل
سنِ اشاعت : ستمبر ۱۹۹۲ء
تعداد : چھ سو
ناشر : شبنم رضوی
قیمت : پچاس روپے
کتابت : عبدالغفار، فیاض احمد
طباعت : نیو پبلک پریس۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
تقسیم کار : نصرت پبلیشرز، حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸
شبانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ محلّہ قبرستان، ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶
بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

امّی کے نام

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

عصمت کی ناول نگاری

ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں

شبنم رضوی

اپنی بات

عصمت کے تخلیقی سحر کا اسیر ہو جانا کوئی خاص بات نہیں۔ وہ لکھتی ہی ایسا ہیں کہ جس نے ان کو غور سے پڑھ لیا وہ ان کی تحریروں میں گم ہو گیا۔ آج مجھے اس پر رشک آتا ہے کہ میں عصمت چغتائی کے تخلیقی کارناموں سے کسی حد تک واقف ہوں۔ میں نے عصمت کے افسانے کب پڑھنا شروع کر دیئے یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے جو ملا جہاں ملا پڑھا۔ ہندی اردو اور انگریزی جس زبان میں بھی ملا پڑھا۔ جب ان کی تخلیقی تحریریں نہیں ملتیں تو ان کے افسانوں اور ناولوں پر نقدین نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ لیتی۔ غرضکہ نہ جانے کیا کیا پڑھا اور تو اور عصمت آپا کے چکر میں نفسیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کو پڑھ کر عصمت آپا کی کہانیوں اور ناولوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور سمجھ جانے کے واہمے میں بتلا ہو گئی۔

یہ اتفاق ہی ہے کہ میں نے عصمت کو 'لحاف' سے نہیں بلکہ 'ٹیڑھی لکیر' سے پڑھنا شروع کیا۔ اس ناول کو پڑھ کر میں نے عجیب سی بے چینی محسوس کی اور میں وہ فرسٹریشن تلاش کرنے لگی جو ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمن میں موجود تھا۔ ناول کے انتساب 'ان یتیم بچوں کے نام جن کے والدین بقید حیات ہیں' کو دیکھ کر کچھ کچھ سمجھ میں آیا لیکن جب تک میں کچھ سمجھنے کا دعویٰ کرتی ذہن سے نکل گیا۔ میں جو کچھ تھوڑا بہت سمجھی وہ اس طرح ہے۔

'انحراف' کو ایک لائحہ عمل اور طرز عمل کے طور پر جینے کا قصد اس ناول کی بنیاد ہے۔ اسی انحراف کو COMMITED STRETAGY بنا کر پیش کرنے کی کامیاب سعی نے اسے شاہ کار کا درجہ عطا کیا ہے۔ "لکیر" کسی شبے کے گنجلک اور طرح دار ہونے کا تصور نہیں دیتی، لکیر کا سیدھا اور واضح تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ DEMAK-CATION کا 'لکیر' نشاندہی، وضاحت، سادگی، سیدھا پن، معصومیت، نادانی،

بے حسی اور بے حرکتی وغیرہ کا عکس پیش کرتی ہے لیکن جب اس میں کج پیدا ہو جائے، طرح پیدا ہو جائے اور یہ ٹیڑھی ہو جائے تب ....؟ شمن بن جاتی ہے ......!

شمن جیسے عصمت چغتائی نے آٹھ دس لڑکیوں کو ملا کر بنایا ہے اور ایک لڑکی کو اوپر سے ڈال دیا ہے، یہ ایک لڑکی کوئی اور نہیں وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے

"کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے ــــ مجھے خود آپ بیتی لگتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریوں سے جل بھی اٹھی ہوں۔ اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔ اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔ اس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخارے بھی لئے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں ــــ"

عصمت نے یہ ناول تب لکھا جب وہ پہلی مرتبہ "ثمر بخشی" کے مرحلۂ اعزاز سے گذر کر سرخرو ہونے والی تھیں......! میں نے عصمت کی ناول نگاری کا مطالعہ اسی ناول کی روشنی میں کیا ہے۔ اس ناول کے ہر گوشے کو خوب سمجھنے کی کوشش کی ہے، ہر پہلو سے ــــ میں کتنی کامیاب ہوئی ہوں ــــ نہیں جانتی، کتاب پڑھنے والے بتائیں گے۔

کتاب کے دو باب "عصمت چغتائی اور جرأت نسواں" اور "ٹیڑھی لکیر میں نفسیاتی الجھنیں" مجھے بہت عزیز ہیں کیوں کہ میں نے ان دونوں ابواب میں بہت محنت کی ہے نفسیاتی الجھنوں میں الجھ بھی گئی ہوں۔ کبھی مجھے یہ باب اغلاط نامہ نظر آتا ہے تو کبھی کچھ اور...... جو کچھ بھی ہے قارئین کے سامنے ہے۔

ایک نتیجہ میں نے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ عصمت ہزار کوششوں کے باوجود فرائڈ کے نظریہ سے انحراف نہیں کر پائی ہیں۔ ان کے بقول فرائڈ کہتا ہے کہ انسان میں کج پیدا ہونے کی وجہ جنس ہے جبکہ عصمت اسے یوں جھٹلاتی ہیں کہ ماحول انسان کو بناتا بگاڑتا ہے۔

کتاب لکھنے کا مقصد مصنف کے طور پر اپنی پہچان بنانا ہرگز نہیں کیونکہ کتاب چھپواکر کسی طرح کی ادبی پہچان ہو ہی نہیں سکتی۔ کتاب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو کام میں نے کیا ہے وہ دوسروں تک پہنچے خصوصاً اساتذہ تک۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے ریڈر اور میرے کرم فرما ڈاکٹر صادق کی میں خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ اس مسودے کی تیاری میں انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ان کی نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے مفید مشورے دئے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، کہ جن کی صحبتوں نے مجھے اردو کے آداب اور سلیقے سکھائے اپنی اس خوش نصیبی پر آج بھی نازاں ہوں کہ علوی صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے ادب کے اسرار و رموز جانے سمجھے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے جو حوصلہ درکار تھا وہ میرے ماموں راہی معصوم رضا (مرحوم) نے دیا۔ ان سے لمبی لمبی بحثوں کے بعد ہی میں اس کتاب کو مکمل کرنے اور چھپوانے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر پائی۔ مونس ماموں اور امیر ماموں نے میرے لئے تمام راستے آسان کئے۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سینیئر اسکالر ڈاکٹر مظہر احمد کی بھی شکر گذار ہوں کہ مسودے کی تیاری میں انہوں نے میری مدد کی۔

کتاب جب کتابت کے مرحلے میں تھی تبھی عصمت آپا کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد جو خصوصی نمبر شائع ہوئے ان میں بعض اطلاعات میرے لئے نئی تھیں۔ بہت سی باتیں میں اس کتاب میں شامل کرنا چاہتی تھی جو ان کے انتقال کے بعد میرے ذہن میں آئیں۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا کیونکہ کچھ نئے ابواب کا اضافہ کرنا پڑتا۔

آخر میں ان سب حضرات سے ایک گذارش جو اس کتاب کو پڑھیں کہ اپنی رائے سے نوازنے کی زحمت کریں، جو کمیاں نظر آئیں ان کی نشاندہی ضرور کریں۔ میں ان سب کی ممنون رہوں گی۔

شبنم رضوی

جراًتِ نسواں اور عصمت چغتائی

ہر تخلیق کار کی تخلیق میں اس کی اپنی شخصیت عادت اور خیالات کی جھلک آہی جاتی ہے۔ اگر فن کار رومانی ذہن کا مالک ہے تو رومانیت اس کی تحریر میں چھائی رہے گی اسی طرح اگر فن کار کی شخصیت الجھی ہوئی اور پیچیدہ ہے تو اُس کے کردار یا تحریر بھی زیادہ اُلجھی ہوئی، پریشان، بکھری بکھری سی نظر آئے گی۔ یا پھر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان بظاہر جیسا نظر آتا ہے تخلیق اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

ایک فن کار وہ ہے جو اپنے خیالات کو اپنے کرداروں میں پیش کرتا ہے اور ایک فن کار وہ ہے جو اپنے کردار کو اپنے آپ کو اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے مگر جہاں تک عصمت چغتائی کا تعلق ہے انہوں نے اپنے اندر کی ضد، الھڑپن بغاوت جرأت اور جستجو کو جگہ جگہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے کرداروں میں پیش کیا ہے ان کے ناولوں کی ہیروئنوں کے اندر عصمت ہر جگہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ معصومہ کی بیگم صاحبہ ہوں یا سودائی کی چاندنی باندی کی حرمہ یا گوری بوی یا ٹیڑھی لکیر کی شمّن یا پھر دل کی دنیا کی قدسیہ خالہ ہوں۔

عصمت چغتائی بچپن سے ہی ضدی اور منہ پھٹ رہی ہیں۔ اپنا حق لینا اور حق کے لئے لڑائی کرنا انہوں نے بچپن سے ہی سیکھا ہے۔ عصمت اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اس طرح جب بہنوں میں جاتیں تو وہاں چھوٹا سمجھ کر بھگا دیا جاتا اور جب بھائیوں میں کھیلنے کو جاتیں تو وہاں سب ان کو لڑکی کہہ کر بھگانا چاہتے مگر عصمت ڈٹی رہتیں اور بھائیوں کے ساتھ ہاکی، فٹ بال گلی ڈنڈا کھیلتیں اور پتنگیں اڑاتیں۔ ان کے کردار میں ہمیں جو اکھڑپن نظر آتا ہے اس کی وجہ بھی شاید بھائیوں کے ساتھ کھیلنا ہی تھا۔ عصمت بچپن ہی سے ہٹ دھرمی اور منہ پھٹ تھیں اور ضد کی پکی بھی۔ مجال ہے جو کوئی ان کے ساتھ ناانصافی کر جائے اپنے بچپن کا ایک واقعہ وہ یوں بیان کرتی ہیں۔

"گھر میں بچوں کی ہوا خوری کیلئے ایک ٹٹو تھا۔ سفید۔ میں نے کہا میں بھی جاؤں گی۔ اماں نے کہا۔ لڑکیاں گھوڑے پر نہیں چڑھتیں۔ ابا کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور کہا۔ یہ جایا کرے گی۔ پھر میں اپنی باری لیا کرتی تھی۔ اس وقت میری عمر چار پانچ سال کی تھی۔"

عصمت جاہلانہ باتوں اور بوسیدہ رسم ورواج کے خلاف تھیں۔ ان باتوں سے بغاوت کرنا انہوں نے بچپن سے ہی سیکھ لیا تھا۔ بغاوت جہاں بری چیز ہے وہیں بہت کارآمد چیز بھی ہے۔ چونکہ عصمت چنگیز کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس وجہ سے بھی ان کا ڈیل ڈول بہت اچھا تھا۔ اور کم عمری میں ہی وہ بڑی دکھائی پڑنے لگی تھیں اس وجہ سے ایک ڈپٹی صاحب جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا عصمت سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ عصمت کی والدہ تو بہت خوش ہوئیں بالکل ہندوستانی عام ماؤں کی طرح فوراً بغیر یہ دیکھے کہ لڑکے کی عمر کیا ہے موٹا ہے دبلا ہے کالا ہے یا گورا یا پھر بوڑھا ہے یا بچہ۔ اس سے حامی بھرنے کو تیار ہو گئیں جب یہ بات عصمت تک پہنچی تو ان کا باغی کردار بغاوت پر اتر آیا۔

"عصمت نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میری شادی اس سے کر دی گئی تو میں بھاگ جاؤں گی اس بات کا ان کی والدہ پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً یہ بات عصمت کے والد کو بتائی انہوں نے عصمت کو بلا کر پوچھا۔ کیوں بھئی کیا بات ہے تو انہوں نے کہا کہ میری شادی وادی کی تو میں یہاں سے بھاگ کر عیسائیوں کے پاس چلی جاؤنگی اور عیسائی بن جاؤں گی۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ ایسے بچوں کو پناہ دیتے ہیں یہ سن کر والد ہنسے اور کہنے لگے "اچھا بھئی تمہاری شادی ڈپٹی سے نہیں کریں گے۔"

بچپن میں شادی سے انکار کر کے عصمت نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بے میل شادی اور لڑکپن کی شادی کے خلاف ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات کا ذکر انہوں نے "لحاف" جیسے افسانے میں کیا ہے۔

عصمت چغتائی کا خاندان تعلیم یافتہ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا ان کے نانا بھی ادیب تھے اس کے علاوہ عصمت کے بھائیوں نے بھی ادب کے میدان میں قسمت آزمائی کی مگر سوائے عظیم بیگ چغتائی کے اور کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ عظیم بیگ چغتائی

طنز و مزاح کے بادشاہ مانے جاتے ہیں۔ مگر عصمت چغتائی کی تحریروں پر ان کے بھائی کا رنگ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ ہاں لکھنا عصمت نے انہیں سے سیکھا۔ ان کی ابتدائی تحریریں رومان سے بھرپور ہوتی تھیں شاید یہ کچی عمر کا تقاضا بھی تھا اس کی ایک مثال دیکھئے۔

"آہا ہا۔ بھتنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں۔ توبہ توبہ۔ شمیم سوز نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر جمیل نے اپنا سفید براق ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور میرے گلابی ہونٹ ...."

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی سر میں بیسن ڈال چکی تھی اف فوہ بیان نہیں کر سکتی کیا حالت ہوئی۔

یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

"ہیبت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ ہی سے زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شمیم بے چارہ کاغذ پھینک بھاگ میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ ڈالا۔ وہ بیچارہ ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔ شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلا دیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بے چارہ پرلے درجے کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لئے کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا۔

شروع کی رومانی تحریریں سپرد آتش کرنے کے بعد مدت تک کچھ نہیں لکھا اور پھر جب لکھنا شروع کیا تو ان کی تحریر پر برنارڈ شا کا اثر نمایاں تھا۔ ہاسٹل میں جہاں وہ رہتی تھیں لڑکیاں برنارڈ شا کہہ کر پکارا کرتیں مگر جلد ہی انہوں نے اس خول کو بھی اتار پھینکا۔ اور خود اپنی پہچان بنانے کے لیے نئے راستے پر چل نکلیں

عصمت کی شخصیت ضدی، اکھڑ، فسادی اور باغی تھی۔ اسی طرح ان کے افسانوں

اور ناولوں کی ہیروئن بھی اکھڑ، نٹ کھٹ، ضدی اور باغی ہوتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن زندگی سے سمجھوتہ تو کرتی ہے مگر اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے وہ مردوں کے اس سماج سے اپنے حقوق کو مانگتی اور چھینتی نظر آتی ہے وہ باغی بھی ہے اور بھولی بھی۔ عصمت کی ہیروئن کی جرأت، عمل، سوچ اس کا تخیل اور ہمت دیکھنی ہو تو ان کے ناولوں کا مطالعہ کیجئے۔ جو معصوم بھی ہوتی ہے بدتمیز بھی اسے حق کیلئے جان دینا بھی آتا ہے تو حق کے واسطے وہ جان لے بھی لیتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن تعلیم یافتہ ہو یا گھریلو عورت اپنے حق سے انجان کبھی نہیں رہتی۔ ان کی ناولوں میں چند نسوانی کردار اپنی جرأت کی وجہ سے تمام اردو ناولوں میں ایک مثال بن گئے ہیں۔ انہی جاں باز کرداروں میں "ضدی" کی سانتا "معصومہ" کی بیگم صاحبہ "ٹیڑھی لکیر" کی شمن "دل کی دنیا" کی قدسیہ خالہ "سودائی" کی چاندنی "جنگلی کبوتر" کی عابدہ "باندی" کی گوری بیوی اور رحمہ وغیرہ چند ایسے کردار ہیں جنہوں نے زندگی کی سیدھی سادی سڑک کو پار کرنے کے بجائے اپنے لئے راستے کا انتخاب خود کیا ہے اور اس پر چل کر کامیاب بھی ہوتی ہیں۔

عصمت کے ناولوں کی ہیروئن

"معصومہ" ناولٹ میں عصمت نے ملک کے بٹوارے کے وقت جاگیردارانہ گھرانوں پر آنے والی آفت و پریشانیوں کا ذکر ایک نئے انداز میں کیا ہے۔ اس ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ معصومہ کے والد فوج میں نوکر تھے جب ملک کا بٹوارہ ہو گیا تو انہوں نے زمین جائداد بیچ کر اور اپنے تینوں بڑے بیٹوں کو لے کر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا مگر جانے کے بعد مدت تک خاموش رہے ہندوستان میں ان کی "بیگم صاحبہ" تین لڑکیوں اور ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ رہ جاتی ہیں اور تب شروع ہوتا ہے مصیبتوں کا سلسلہ۔ بیگم صاحبہ نے پہلے تو گزارے کے لئے گھر کا سامان فروخت کیا۔ پھر زیورات بیچے مگر کسی بھی حالت میں پاکستان سے ان کے شوہر کا بلاوا نہ آیا۔ لمبی خاموشی ایک خط کے ذریعہ ٹوٹتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شوہر نے انیس برس کی ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ لڑکے بھی اپنا گھر بسا چکے ہیں اور حد تو تب ہوئی جب ان کے شوہر نے لکھا کہ وقت پڑنے پر وہ انہیں طلاق بھی دیدیں گے۔ اس حادثے سے بیگم صاحبہ کو بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس غم و غصہ کا اظہار وہ

رو پیٹ کر کرتی ہیں اور اس ظالم سماج سے اپنا حق مانگتی ہیں اپنا سہاگ مانگتی ہیں انصاف چاہتی ہیں مگر ان کی آواز و فریاد ظالم سماج کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ روتی رہتی ہیں۔ گڑگڑاتی رہتی ہیں مگر جلد ہی انہوں نے اس ظالم سماج کے سامنے رونا مناسب نہ سمجھا اور تب ان کے زخمی ضمیر کے اندر سے ایک نئی اور باغی عورت کا جنم ہوتا ہے جو روتی نہیں، تڑپتی نہیں کسی سے اپنا حق مانگتی نہیں بلکہ جو کچھ چاہیئے وہ اسے جائز یا ناجائز طریقہ سے بہر صورت اس بے درد سماج سے چھین لیتی ہے۔

بیگم صاحبہ نے گھر کا خرچ چلانے، بچوں کو پالنے، مکان کا کرایہ ادا کرنے کیلئے جو راستہ نکالا وہ قابل رحم بھی ہے اور قابل تعریف بھی۔ بیگم صاحبہ نے اپنی انیس برس کی بیٹی معصومہ کو طوائف بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سانحہ نہ صرف اردو ناول نگاری کے لئے ایک نیا تجربہ تھا بلکہ اس حقیقی زندگی کے لئے بھی بہت انوکھی بات تھی جس کے اندر ایک سوال چھپا تھا "کہ لو اگر تم کسی کی مجبوری کی وجہ سے انیس برس کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہو تو تمہاری بیٹی بھی مجبوری میں طوائف بن سکتی ہے۔" یہ بات پورے مرد سماج کے منہ پر ایک طمانچہ تھی اور تب جب کہ وہ معصومہ کا سودا کر رہی تھیں ایک بے باک نائیکہ کی طرح ان کے اندر نہ جھجھک ہوتی ہے نہ شرم وہ کہہ اٹھتی ہیں

"فلیٹ بچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔ لڑکی بغیر ان کی مرضی کے رات کو باہر نہیں رہے گی۔"

یہ وہی ماں ہے جس نے اپنے ممتا کے آنچل میں چھپا کر اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا جس نے انیس برس تک ناز برداری کی تھی اپنے خون سے اس ننھے سے پودے کو سینچ کر بڑا کیا تھا جسے بار بار دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کی ہدایت دی تھی جس کے کھل کر قہقہے لگانے پر اعتراض کیا تھا جس کی شادی کے لئے بچپن سے ہی رشتے آنے شروع ہو گئے تھے اور قرآن شریف سے دیکھ کر اس کا نام معصومہ رکھا گیا تھا اسی لاڈلی بیٹی کو ایک ماں طوائف بنا رہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ماں میں ممتا کا فقدان تھا۔ وہ پیار کے جذبات سے محروم تھی۔ نہیں آج بھی ممتا میں فرق نہیں تھا وہ تو صرف حالات سے لاچار اور روزی روٹی سے مجبور تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے

شرمندہ بھی تھیں تبھی تو معصومہ کو سوتا ہوا دیکھ کر سوچتی ہیں۔

"آج اس سے کیوں کر کہیں کہ اب تیرے سوا زندگی کا اور کوئی سہارا نہیں، تجھے قربانی دینا ہوگی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگانے کیلئے پتوار بننا ہوگا۔"

بیگم صاحبہ جب دلال اور خریدار کو سامنے دیکھتی ہیں، حالانکہ وہ سودا طے کر چکی تھیں پھر بھی مارے غصہ کے سوچتی ہیں کہ

"وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھیں ایک بار جی چاہا اس کے منہ پر تھوک دیں۔ حرام زادے تیری بھی تو کنواری بیٹیاں ہیں۔ جان پر ایک نظر ڈال آ کیا یہ روپیہ انہیں الماریوں میں سے نکال کر میری معصومہ کو خریدنے آیا ہے جیسے وہ بھی آٹے کی بوری یا گھی کا کنستر ہے۔"

بیگم صاحبہ جو عام ماؤں کی طرح بیٹی کی خیر خواہ تھیں جب بیٹی کا سودا کر چکیں تو ساری جھجک ساری شرم یک لخت پرانے کپڑے کی طرح اتار کر پھینک دیتی ہیں اس وقت یہ دولت بٹور کر علیش کرنے والی ایک تیز طرار مکار اور مطلب پرست عورت کے روپ میں نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ بار بار معصومہ عرف نیلوفر کو سمجھاتی ہیں کہ تم جس پیشہ میں ہو وہاں پر صرف دولت اور جوانی کام آتی ہے اور کچھ نہیں۔ اس لئے جب تک یہ دونوں چیزیں ہیں دولت بٹور لو۔

"کتنا سمجھایا حرام زادی نیلوفر (معصومہ) کو کہ زیور لے یہ کوڑے کرکٹ میں پیسہ مت غارت کر۔"

مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ایک ماں ایسا برتاؤ بیٹی سے کر سکتی ہے۔ وہ بھی صرف آرام کے لئے یا پھر صرف اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لئے۔ یہ جرأت اتنی آسان بات نہیں مگر بیگم صاحبہ کے حالات کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے اندر بدلہ لینے کی زبردست خواہش تھی وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح ان کے شوہر نے انہیں اذیت پہنچائی ہے میں بھی انہیں ایسی تکلیف پہنچاؤں کہ ان کے بھی آنسو نہ تھمیں۔ وہ بھی چیخ چیخ کر روئیں اور کوئی ان کی فریاد نہ سنے۔ بیگم صاحبہ ان عام عورتوں میں سے نہیں تھیں جو شوہر کی دوسری شادی کرنے پر صبر کر لیتی ہیں اور آنسو بہا کر خدائی مرضی سمجھ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔
بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو تکلیف پہنچانے کیلئے جو راستہ نکالا وہ بالکل انوکھا اور نرالا تھا۔

"ــــ اس طرح انہوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لے لیا۔ ادھر وہ کسی کی
انیس برس کی کونپل کو کھول رہے تھے ادھر ان کی اسی عمر کی بیٹی کے دام
لگ رہے تھے بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحب زادی نے دھندا
شروع کر لیا تو مزا آجائے گا۔"

سوداتی عصمت کا ایک مختصر سا ناول ہے اس ناول میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جسے بچپن میں دیوتاؤں کی طرح پالا گیا تھا اس کی آرتی اتاری جاتی سب اس کی عزت کرتے انہیں نیک فرشتہ سمجھا جاتا ایک رشتے کی موسی نے انہیں پالا پوسا تھا ان کی خواہش تھی کہ بڑے سرکار کی شادی ان کی بیٹی اوشا سے ہو جائے۔ بڑے سرکار اپنے بھائی چندر اور بہن یمو سے بہت بڑے تھے اور اوشا انہیں پوجتی تھی ایک چاندنی ہی ایسی تھی جو نہ ان سے ڈرتی تھی نہ ان کی عزت کرتی۔ چاندنی کو چندر گھورے پر سے اٹھا لایا تھا اس گھر میں اس کی پرورش ہوئی تھی اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا حالانکہ وہ لاوارث تھی پھر بھی وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں سمجھتی وہ بڑے سرکار کے چہرے پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب ہٹانا چاہتی ہے اور لوگوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کرانا چاہتی ہے ایک لاوارث لڑکی جس کا اس گھر کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا پھر بھی وہ بڑے سرکار سے نہیں ڈرتی۔ جب اسے شک ہو گیا کہ اسے غسل خانہ میں نہلاتے وقت بڑے سرکار ہی جھانک کر دیکھتے ہیں انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے وہ ایک ڈراما کھیلتی ہے۔

"ــــ مگر اس نے طے کر لیا کہ وہ کسی طرح جھانکنے والے کو پکڑ لے گی۔ اس نے
شیشے کا سوراخ بند نہیں کیا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے یونہی پانی گرانا شروع
کیا باغ کے دروازے کی کنڈی کھلی رکھی۔ اس کی نظریں شیشے پر جمی ہوئی
تھیں۔ جھانکنے والے کو اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے ہلکا سا سایہ دکھائی دیتا
ہے جیسے ہی کھرچی ہوئی جگہ پر آنکھ آئی۔ چاندنی نے دھڑ سے دونوں پٹ کھول
دیے۔ سامنے بڑے سرکار کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں زمانے بھر کی
غلاظتیں یکجا تھیں۔"

ایک بے سہارا لاوارث لڑکی نے نہ صرف ان کی شکل پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب ہٹایا

بلکہ ان کے پیار کو بھی ٹھکرا کر یہ ثابت کر دیا کہ عورت کا پیار پیسوں سے نہیں خریدا جا سکتا۔ ادشا نے اسے زہر کھا کر اس گھر کے قرض اتارنے کی بار بار رائے دی مگر وہ مرنے کو تیار نہ تھی ادشا نے اسے سورگ کے حسین خواب دکھائے۔ دوسرے جنم کے آنند بھرے جیون کا بہلاوا دیا۔ بلیدان پر لکچر جھاڑے مگر وہ کسی بھی طرح بہلاوے میں نہ آئی۔ اور آخر کار بڑے سرکار کو اس کے آگے جھکنا پڑا وہ زہر کھا کر مر جاتے ہیں اور چندر سے چاندنی کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک لاوارث لڑکی کی یہ جرأت قابل تعریف ہے۔

یوں تو عصمت چغتائی کے سبھی ناولوں میں عورت کا باغی روپ نظر آتا ہے وہ ہر اس چیز سے بغاوت کرتی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتی۔ موجودہ سماج سے اس کے بوسیدہ رسم و رواج سے۔ عورت کی موجودہ حالت کے خلاف مذہب کے خلاف وہ احتجاج کرتی نظر آتی ہے اپنے ماحول سے بغاوت کرتی ایک لڑکی قدسیہ خالہ کے روپ میں نظر آتی ہے۔ عصمت کے ناول "دل کی دنیا" میں۔

قدسیہ خالہ کی جب شادی ہوئی تھی تب وہ عام لڑکیوں کی طرح بہت خوش تھیں مگر شادی کے فوراً بعد ہی ان کے شوہر کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیج دیا گیا کیونکہ یہی تو شادی کی پہلی شرط تھی جب ان کے شوہر واپس آئے تو ساتھ میں ایک میم بھی لے آئے۔ اور قدسیہ خالہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئیں۔ شروع میں قدسیہ خالہ کا کردار نہایت سیدھا سادہ تھا یہ بھولی اور معصوم سی نظر آتی ہیں۔ مگر ناول کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے کردار میں بھی تیزی چالاکی اور جرأت عود کر آتے لگتی ہے۔ شروع میں قدسیہ خالہ کی جسمانی خواہش پوری نہیں ہو پاتی اس لئے دبے چین، پریشان اور اداس سی رہتی ہیں۔ گھر والے اس کیفیت کی وجہ سمجھ نہیں پاتے اور اس کا علاج جلاب پلا کر گنڈے تعویذ اور نماز روزے کا بہلاوا دیکر کرنا چاہتے ہیں مگر قدسیہ خالہ کو اپنی بیماری کا علاج رشتے کے ایک دیور بشیر حسن میں نظر آتا ہے اور وہ ان کی طرف جھکتی چلی جاتی ہیں حالانکہ ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ کوئی محبت کرتا مگر قدسیہ خالہ محبت کے باوجود گھر والوں کے ڈر سے بات تک نہیں کرتی تھیں وہ والدین کی مرضی سے ہر کام انجام دیتی تھیں۔

" ـــــ اے بیٹی قدسیہ ذرا سا دودھ پی لو"

"اچھا بی اماں ....."

"بیٹی اب لیٹ جاؤ کب سے کھونٹا سی بیٹھی ہو ایسے کب تک پڑی رہو گی۔ اب اٹھ بیٹھو"

مگر اس بے زبان قدسیہ خالہ نے چند برسوں بعد ہی یہ جان لیا کہ دبی سہمی قدسیہ زندگی کی کوئی خوشی حاصل نہ کر سکے گی کیونکہ یہ بے رحم دنیا ان لوگوں کو اور بھی دباتی ہے جو تھوڑا سا بھی دبتے ہیں۔

قدسیہ خالہ نے اس حقیقت کو بھی جان لیا کہ دوسروں کے بنائے راستے پر چلنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ہر انسان کے ساتھ ایک نئی طرح کی پریشانی آتی ہے اور اس نئی پریشانی کے حل کیلئے نیا راستہ ایجاد کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسروں سے حق و انصاف کی امید رکھنا بھی بے کار اور فضول ہے اس سماج سے خوشی کی امید رکھنا ویسا ہی ہے جیسے ٹوٹے گھڑے میں پانی جمع کرنے کی امید۔

ان سب حقیقتوں سے آشنا ہونے کے بعد قدسیہ بیگم میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی پہلے وہ بشیر حسن سے سامنا ہونے پر گھبرا جاتی تھیں اب کھلے طور پر سب کے سامنے ملتیں باتیں کرتیں کتابیں لیتیں اور باتیں کرتی نظر آتیں۔ پہلے یہ میلا کپڑا پہنے بستر پر آنکھ بند کئے پڑی رہتیں نہ کسی سے باتیں کرتیں نہ ہنستیں مسکراتیں۔ دنیا سے بیزار۔ زندگی کو ایک سزا کی طرح گزارتی تھیں۔ اور بات بات پر اپنے اوپر مرگی کے دورے ڈال لیتیں۔ شوہر کے نام پر وقت بے وقت رویا کرتیں مگر جب سے انہوں نے بشیر حسن سے ملنا شروع کیا تھا ان کے اندر غیر معمولی تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے اپنے نامراد شوہر کے نام پر رونا دھونا اور خود اپنے آپ پر ترس کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ طرح طرح سے تیکھے مسالہ کو کوٹ کر ابٹن بنا کر ملتیں بالوں کو سنوارتیں خوبصورت اور نفیس کپڑے پہنتیں بھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہنتیں۔ پھولوں کی بالیاں پہن کر میرا کے بھجن گایا کرتیں ـــ "میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی"۔ قدسیہ کے بدلتے یہ تیور دیکھ کر جب گھر والے انہیں ٹوکتے یا اعتراض کرتے تو وہ ایسا مسکرا کر تیوری چڑھاتیں کہ سب ڈر جاتے۔ جب یہ نئی خودسر قدسیہ خالہ کسی کے بس میں نہ آئیں اور من مانی کرنے لگیں تو گھر والوں نے طے کیا کہ انہیں سسرال بھیج دیا جائے سسرال کا نام سنتے ہی قدسیہ بیگم آگ بگولہ ہو جاتی ہیں اور اب تک کی دبی نفرت کی آگ یکایک بھڑک اٹھتی ہے

اور وہ اپنے سسرال والوں پر ٹوٹ ہی تو پڑتی ہیں۔

"۔۔۔ بیٹے کو کچھ نہیں کہتا مکار کہیں کا۔ آگ لگے اس کی داڑھی میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ارے بدبخت تیرا ماموں ہے۔ نانی بیوی چلائیں۔
تھو ہے ایسے ماموں پر جہنم میں جھوٹے منہ سے اپنے بیٹے سے نہ کہا گیا کچھ؟ ارے وہ تو بڑے خوش ہیں میم آئی ہے تو للو پچو کرتے ہیں چھری کانٹے سے میز کرسی پر ڈنر کھاتے ہیں بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں نا۔ اسی لئے میم کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔ بس وہ میم ہی تو انہیں بخشوائے گی! اسی کا سایہ پکڑ کر جنت ملے گی ۔۔۔"

قدسیہ کی زبان درازی سے والدہ چونک پڑیں کہاں وہ قدسیہ کے اٹھنے بیٹھنے میں بھی ماں کا حکم مانتی تھیں اور کہاں اب سسرال والوں کو گالیاں دے رہی ہیں۔ والدہ نے مارے غصہ کے جوتی اٹھالی قدسیہ کو مارنے کیلئے یہ دیکھنا تھا کہ مارے غصہ کے قدسیہ نے والدہ کا ہاتھ پکڑ کر اینٹھ دیا جب گھر والوں نے دیکھا کہ قدسیہ بیگم والدہ کو مار رہی ہیں تو لوگ ہائے توبہ مچا کر بھاگے قریب تھا کہ قدسیہ کی جرأت پر سب ٹوٹ پڑتے مگر مرگھٹ کی بھتنی چوٹ کھائی ناگن اور زخمی شیرنی کی طرح قدسیہ بیگم گرجیں۔

"۔۔۔ خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی!
قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔
آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی ۔۔۔"

جس طرح انڈے میں سے بچہ نکلتا ہے اور اس کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ قدسیہ خالہ بھی اپنا چولا بدل چکی ہیں۔ جہاں پرانی قدسیہ کی جھلک نہ رہی تھی جب قدسیہ بیگم کی تبدیلی اور تیزی پر گھر والوں کا بس نہ چلا تو سب نے کہنا شروع کیا کہ قدسیہ بیگم کے سر پر کوئی آتا ہے۔ اور اس خبر کا عام ہونا تھا کہ یکایک قدسیہ بیگم کا عہدہ بڑھ گیا۔ سبھی لوگ ان سے ڈرنے لگے اور ہر طرف سے محبت کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب کوئی کچھ نہ کہتا۔ مگر قدسیہ بیگم کو سکون تو ابھی بھی نہیں ملا تھا صحیح راستہ کی جستجو تو ابھی بھی باقی تھی۔ اب انہوں نے شوہر کے نام پر کڑھ کڑھ کر زندگی گزارنا مناسب نہ سمجھا اور ایک روز نئی

راہ پر چل پڑیں اسی بشیر حسن کے ساتھ۔

ایک روز جب پورا گھر خواب غفلت میں مدہوش تھا قدسیہ خالہ نے گھر کو چھوڑ دیا اس گھر کو جہاں ان کی خوشی چھینی جاتی تھی جہاں اچھے کپڑے اور زیور پہننے پر روکا جاتا تھا جہاں صرف ان کی محرومیوں پر ترس کھایا جاتا تھا ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا تھا۔ قدسیہ بیگم کا کردار ان ہزاروں لاکھوں دبی سہمی لڑکیوں کا نمائندہ نظر آتا جن کے ساتھ بالکل قدسیہ بیگم جیسے حادثات گزرتے ہیں بس ضرورت ہے تو قدسیہ بیگم جیسی ہمت کی جس روز عورت خود اپنے لئے فیصلہ کرنا سیکھ جائے گی اسی روز وہ مضبوط بھی ہو جائے گی اور اپنی کھوئی خوشی بھی حاصل کرلے گی۔

"باندی" عصمت کا نہایت مختصر سا ناول ہے اس ناول کا موضوع نوابین اور ان کی عیاشیاں ہیں۔ اسلام میں نکاح کے بغیر کسی عورت یا مرد سے تعلق بنائے رکھنا بدکاری سمجھا جاتا ہے مگر نوابین اپنے فائدہ کے لئے اپنے عیش و آرام کے لئے مذہب کے قاعدے قانون کو بدل ڈالتے ہیں۔ جاگیردارانہ سماج میں باندیاں رکھنے کا رواج عام تھا یہ باندیاں خریدی بھی جاتی تھیں اور پالی بھی جاتی تھیں جہاں ایک طرف یہ گھر کا کام کاج کرتیں وہیں دوسری طرف نوابین کے بستر بھی گرم کرتیں اس غلامی کے باوجود باندیوں کی کوئی عزت نہ تھی اور ان کی اولادیں غلاموں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں۔ جائداد میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ باندیوں سے تعلق رکھنا فخر سمجھا جاتا تھا اور ایک نواب کئی کئی باندیوں سے تعلق رکھتے تھے ایسے میں بیویوں پر کیا کچھ گذرتی ہوگی اس کا ذکر اس ناول میں بخوبی ملتا ہے۔ آج تک عورتیں اپنے شوہروں کے ظلم و ستم کو ہنسی خوشی برداشت کیا کرتی ہیں یہ انسانی فطرت ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں اس کا بٹوارہ پسند نہیں کرتے مگر نوابین کی بیویوں کو یہ بھی برداشت کرنا پڑتا کہ ان کا شوہر کئی کئی باندیوں کے ساتھ عیاشی کرتا ہے۔ اس ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے حرمہ جو یہ جاننا چاہتی ہے کہ لڑکیوں کو بھی نواب زادوں کی طرح عیاشی کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ کیا وہ بھی کئی کئی لڑکوں سے تعلق بنا سکتی ہے یا نہیں؟ وہ پوچھتی ہے کہ

"اے بٹیا آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ نواب زادے ہیں لونڈی باندی سے تو جی کا بھلا وا ہوتا ہے۔ موئی سے شادی بیاہ نہیں کیا کرتا" "ہوں" تو

نواب زادے شادی کس سے کرتے ہیں۔ ہم نواب زادیوں سے ......"
اور کیا بیٹا ـــــ" بوا کی بوکھلاہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گی۔ حرمہ قریب کھسک کر بیٹھ گئی۔ پوچھیے شوق سے۔ بڑی مری ہوئی آواز گلے سے نکلی نواب زادوں کی باندیاں ہوتی ہیں تمہیں جبار کی قسم سچ بتانا۔
نواب زادیوں کے بھی
......"
"ہے ہے بٹیا" بوا نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ ذرا شرم کیجیے یہ سوال کل بھی تھا اور آج بھی باقی ہے کہ عورت کو کئی کئی مردوں سے تعلق بنانے کا رواج کیوں نہیں ہے اسے اجازت کیوں نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اسے معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوال کل جاگیردارانہ نظام میں بھی تھا اور آج ترقی پسند معاشرے میں بھی باقی ہے۔ مگر جرأت ہے حرمہ کی کہ وہ یہ بات پوچھ لیتی ہے ورنہ پہلے لڑکیاں سوال تک نہیں کر سکتی تھیں وہ صرف برداشت کرتی تھیں سہتی تھیں مگر اس کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتی تھیں۔
اسی طرح اس ناول میں گوری بی بی کا ایک مختصر سا کردار ہے جس کی زندگی ایک نواب نے خراب کی۔ جس کا بچہ چاول کی پیچ پی کر بڑا ہوا اور نواب زادی کے بچے نے گوری بی بی کا دودھ پیا۔ حالانکہ اس زمانے میں عام رواج تھا کہ باندیاں اپنا دودھ نواب زادوں کو پلاتی تھیں۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو باہر سے ایسی عورتیں بلائی جاتیں تھیں مگر گوری بی بی اس بات کو برداشت نہیں کر پائی اور جب اسے ایسا کرنا ہی پڑا تو اس کے اندر بغاوت کا جذبہ بدلہ لینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے وہ سوچتی ہے کہ

"ـــــ میرے کلیجے میں تو اس روز ٹھنڈک پڑے گی جب یہ کسی نواب زادی کا پیٹ پھلائے گا۔"

ایک باندی کی یہ خواہش کہ جس طرح اسکی زندگی خراب ہوتی ہے کاش نواب زادی کی بھی ہو۔ اس کے اندر پیدا ہونے والے شدید ترین ردعمل کو ظاہر کرتی ہے۔
عصمت کا سب سے پہلا ناولٹ "ضدی"، ایک رومانی المیہ ہے پورن نام کے ایک ہنس مکھ لڑکے کے اردگرد یہ ناولٹ گھومتا نظر آتا ہے۔ بچپن سے ہی اسے اپنے گھر کی نوکرانی

اُدشا سے محبت ہوگئی تھی مگر گھر والے اس کی شادی شانتا نام کی لڑکی سے کر دیتے ہیں۔ شادی کے بعد پورن نے شوہر کا حق ادا نہ کیا وہ ہر وقت اوشا کی یاد میں کھویا رہتا ہے اور بیمار پڑا رہتا۔ شانتا نے شروع میں پورن کا دل جیتنے کیلئے دل وجان سے اس کی خدمت کی اس کی دلجوئی کی۔ مگر کسی طرح وہ پورن کا دل نہ موہ سکی اور تب اس نے اپنے رشتے کے دیور سے دوستی کرلی وہ کھلے طور پر پورن کے سامنے اس سے (مہیش) اظہارِ عشق کرتی۔ مگر وہ اندر سے بیچین ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح زندگی بسر کرے گی۔ کیونکہ جس کا شوہر ہی اپنا نہ ہو اس کا شوہر کے گھر سے کیا تعلق۔ اوشا کے سامنے بھی دو راستے تھے یا تو وہ زندگی بھر سسرال میں بغیر اپنے شوہر کے زندگی گذار دیتی تب اسے زندگی کی خوشیاں نہ مل پاتیں۔ مگر دوسری طرف مہیش کی محبت تھی جہاں رسوائی اور بے عزتی تو تھی مگر دل کا سکون اور سچی خوشی بھی تھی وہ خود بار بار اس بارے میں سوچتی ہے۔

”— شانتا کے سامنے بھی دو ہی راستے تھے ایک تو وہی جس پر وہ چل رہی تھی یعنی پتی ورتا ہندوستانی بیوی بن کر جگ کی لاڈلی؟ نیک اور پارسا جہاں وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھک رہی تھی۔ اس سے بھی بدتر مٹی کے ڈھیلے سے کبھی کوئی گھاس پھوس کا تنکا تو اگ آتا ہے وہ بھی کبھی کسی مصرف میں آجاتا ہے مگر وہ تو اور ہی کچھ تھی۔ اس ٹھنڈی چتا میں سال سے اوپر اسے جھلستے ہو گیا—“

مگر شانتا چونکہ عصمت کے ناول کا کردار تھی اس لئے وہ بندھے ٹکے سیدھے راستہ پر چلنا پسند نہیں کرتی وہ جگ کی لاڈلی بننے سے اچھا سمجھتی ہے کہ خوش رہے اور شاید اسی لئے وہ ایک جرأت آزما قدم اٹھاتی ہے ایک روز وہ اس گھر کو جہاں وہ بہو اور بیوی بن کر آئی تھی جہاں سے اس کی ارتھی نکلنی تھی تلانجلی دیتی ہے شانتا نے پورن کو ایک خط لکھا۔

”میں جا رہی ہوں — میں آپ کی کوئی بھی نہیں —

پھر بھی — شانتا —“

شانتا نے وہ کام کیا جسے کرتے ہوئے بڑے بڑے تھراتے ہیں وہ اس گھر کو سدا کے لئے چھوڑ گئی جہاں نہ اس کا سہاگ تھا اور نہ کوئی اپنا۔ شانتا نے دور کی لڑکی تھی اسے زندگی کی خوشیاں عزیز تھیں اس نے ہزاروں لاکھوں سال سے چلی آرہی پرمپرا کو توڑ کر چکنا چور کر دیا

کہ شوہر کا گھر ہی عورت کا اصلی گھر ہوتا ہے اور سسرال سے ارتھی ہی نکلتی ہے کیونکہ وہ اس حقیقت کو جانتی تھی کہ زندگی بغیر کسی سہارے کے نہیں گزر سکتی۔ جس طرح بغیر سہارے کے بیل پھل پھول نہیں سکتی اور اگر پھیلتی بھی ہے تو بے ترتیبی سے جہاں اس کی خوبصورتی اس کی وقعت مٹی میں مل جاتی ہے۔

گھر سے لڑکی یا بہو کا بھاگنا کسی بھی معنی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت کی ہیروئن نہ صرف بدتمیزی کرتی ہے نا انصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہے بلکہ مارتی پیٹتی بھی ہے۔ بغاوت کرتی ہے لڑتی ہے اور گھر سے اکثر و بیشتر بھاگ بھی جاتی ہے مگر پھر بھی بری معلوم نہیں ہوتی بلکہ قاری کو اس کردار سے ہمدردی ہو جاتی ہے وہ اس کے بھاگنے بدتمیزی کرنے اور بغاوت کرنے کو اچھا سمجھتا ہے کیونکہ وہ خود کو کردار کے غم میں اپنے آپ کو شریک پاتا ہے اور ایک اچھے کردار کی پہچان بھی یہی ہے۔

عصمت کی ہیروئن کا ذکر چل رہا ہو اور شمن کا بیان نہ کیا جائے تو عصمت کے اس کردار کے ساتھ نا انصافی ہوگی "ٹیڑھی لکیر" عصمت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے یہ بھی کرداری ناول ہے اس کی ہیروئن شمن کے اردگرد اس ناول کی کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ عصمت کے کرداروں میں واحد یہ کردار ایسا ہے جس نے بچپن سے ہی بغاوت سیکھ لی تھی ورنہ ان کے کردار ماحول سے اکتا کر بغاوت کرتے ہیں مگر شمن بچپن سے ہی ضدی تھی اس نے ہر اس بات پر بغاوت کی جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے ہاسٹل میں رہ کر تعلیم مکمل کی، نوکری کی، شادی سے بغاوت کی اور اپنے پسند کے لڑکے سے شادی کی مگر جب نباہ نہیں پائی تو لڑائی کی اور اس قدر لڑائی ہوئی کہ اسکا شوہر گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس طرح یہ مکمل باغی کردار ہے۔

عصمت کی ہیروئن نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ کیونکہ ان کی ہیروئن قرۃ العین حیدر کی ہیروئن کی طرح وقت کا رونا نہیں روتی۔ وہ وقت کے شکنجے میں رہ کر برباد نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کرشن چندر کی ہیروئن کی طرح محبت اور وفاداری میں اپنے آپ کو مٹا دیتی ہے وہ پریم چند کی ہیروئن کی طرح ڈری ڈری سہمی سہمی بھی نظر نہیں آتی ہے وہ کام بھی کرتی ہے بغاوت بھی کرتی ہے تو اپنے آپ کو گھر والوں کو سماج سے الگ نہیں کرتی بلکہ یہ خود بڑی جرأت اور

ہمت سے آگے بڑھتی ہے اور وقت کے ساتھ چلنا پسند کرتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن رونے دھونے میں یقین نہیں کرتی وہ بغاوت کرتی ہے آواز بلند کرتی ہے چیخ چیخ کرنا انصافی کا اعلان کرتی ہے یہ لڑتی ہے جھگڑتی ہے اور جب کامیاب نہیں ہوتی تو جھنجھلاتی بھی ہے کیونکہ یہی تو ہم اور آپ سبھی کرتے ہیں۔

جو جرأت جو ہمت عصمت کے ناولوں میں نظر آتی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ہاں بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" میں رانو ہے جو لڑتی ہے جھگڑتی ہے روتی ہے اور آخر کار جو چاہتی ہے کر کے دکھا دیتی ہے۔

آکاش وانی کی اردو سروس نئی دہلی سے نشر اور ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ جولائی ۱۹۹۰ء میں شائع۔

عصمت کے ناولوں کا بتدریج ارتقاء

عصمت چغتائی نے اپنے ادبی سفر میں نہ صرف مختصر افسانوں کے ذریعے ہنگامہ برپا کیا بلکہ بعض اہم ناول بھی لکھے ہیں جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث ناول نگاری کے میدان میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ناولوں کی بنیاد پر انہیں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ مختصر افسانوں کی طرح انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے پیش رو قلم کاروں کی پیروی کرنے یا ان کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اپنی راہ الگ بنانے کی کامیاب سعی کی اور اردو ناول کو نئے طرزِ اسلوب، نئے موضوعات اور نئے تجربات سے مالا مال کیا۔ ڈاکٹر ہارون ایوب کے مطابق

"عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفین میں اس حیثیت سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ انہوں نے مسلم متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ دراصل اس طرح وہ مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہیں ـــــــ"[۱]

عصمت کے تقریباً سبھی ناولوں کا موضوع گھریلو زندگی ہے۔ یعنی ان کے کامیاب ناول گھریلو فضا کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عصمت نے گھر کے اندر چھپے ہوئے ان رازوں کو فاش کیا ہے۔ جن کے بارے میں لوگوں کو زیادہ معلومات نہیں تھیں انہوں نے ہندوستانی عورت کو سچائی کے ساتھ عورت ہی کے روپ میں سماج کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ عصمت نے صرف مظلوم بے کس لاوارث اور روتی دھوتی عورت کو پیش

---

[۱] اردو ناول پریم چند کے بعد ہارون ایوب ص ۱۴۰

کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی محرومی کی وجوہات بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عصمت نے گھر کے اندر کے بوسیدہ رستے ہوئے ناسور اور پکتے بھپچاتے ہوئے زخم کو سماج کے سامنے کھول کر رکھ دیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ دلائی ہے۔

عصمت کے ناول بظاہر رومانی محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ نفسیاتی حقائق کو پیش کرتے ہیں، علی عباس حسینی کا خیال ہے۔

"ناول کی صرف دو قسمیں ہونا چاہیئے ایک تو رومانی دوسرے نفسیاتی۔ رومانی ناول تو وہ ہیں جن میں پلاٹ پر زور دیا گیا ہو۔ اور کوئی اخلاقی، عمل، اسراری، تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہو جس میں حسن و عشق کی کشاکشی اور بہادری، جنگ جوئی سیاست وغیرہ کی تصویریں پیش کی گئی ہوں ان سب کو رومان کے نام سے ملقب کیا جائے گا۔ نفسیاتی ناول وہ ہوگا جس میں معاشرت سیرت کردار سے بحث کی گئی ہو اور جس میں تحلیل و تجزیہ نفس سے کام لیا گیا ہو ــــــ" [1]

عصمت کے ناول اپنی آخری پہچان میں نفسیاتی ہی ہوتے ہیں عشق کی چاشنی کے باوجود رومانی نہیں ہوتے حالانکہ ان کا پہلا ناولٹ "ضدی"، جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول شروع سے آخر تک رومانی ہے اور اس ناول میں کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ انسانی جذبات اور ماحول سے متاثر انسانی نفسیات سے عصمت چغتائی کے گہرے لگاؤ کا اندازہ اس ناول سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ضدی، عصمت چغتائی کا پہلا ناول ہے حالانکہ یہ ایک ترکی ناول کا چربہ ہے اور اس کی کہانی دیوداس قسم کا رومانی المیہ ہے۔ اس کا ہیرو پورن ہے جس کے ارد گرد پورا ناول گھومتا ہے یہ ایک ہنس مکھ اور ذہین لڑکا ہے والدین کے آنکھوں کا تارا بھائی بھابھی کا چہیتا ہر وقت ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے اور بچوں کے ساتھ کھیلنا بوڑھی بوا سے اکثر چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اسی دوران اپنے گھر کی آیا کی نواسی آشا سے اس کی دوستی ہو جاتی

ضدی ۱۹۴۰

---

[1] اردو ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی ص ۴۵ - ۴۴

ہے۔ یہ دوستی کب محبت تک پہنچ گئی کسی کو خبر نہ ہوئی پورن کے والدین چونکہ اس شادی کو مناسب نہیں سمجھتے اس لئے آشا کو گاؤں بھیج دیا جاتا ہے اور پورن سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ آشا بیماری میں مر گئی۔ اتفاق سے پورن کی برات جس گاؤں میں جاتی ہے وہاں آشا کی ایک جھلک دیکھ کر وہ دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اور آشا سے ہی شادی کرنے کی ضد کرتا ہے مگر والدین اسے یہ بتاتے ہیں کہ وہ آشا نہیں بلکہ اس کا وہم تھا۔

شادی کے بعد بھی پورن آشا کو ہی چاہتا ہے اور اس کے لئے بے چین رہتا ہے اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے اس کی بے رخی سے عاجز آکر پورن کی بیوی مہیش نام کے ایک لڑکے سے کھلم کھلا عشق کرنے لگتی ہے مگر یہ سب دیکھ کر بھی پورن کو برا نہیں لگتا بلکہ وہ اس کی اس حرکت کو اچھا مانتا ہے۔ دن بدن پورن کی طبیعت خراب ہوتی جاتی ہے وہ لاغر سا مریض بن کر رہ جاتا ہے اس کی حالت پر ترس کھا کر والدین آشا کو بلاتے ہیں لیکن جب تک آشا آئے پورن کی موت ہو جاتی ہے۔ آشا بھی پورن کی موت کو برداشت نہیں کر پاتی اور آگ لگا کر خود بھی ستی ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول رومانی المیہ ہے اس میں کوئی خاص بات بیان نہیں کی گئی ہے پورن کا کردار صرف تخیل کی دنیا تک بلند ہے عملی طور پر نہایت ہی کمزور ثابت ہوتا ہے آشا بھی ایک عام سی لڑکی ہے اس ناول میں اگر کوئی قابل تعریف کردار ہے تو وہ پورن کی بیوی شانتا کا ہے جس میں ارتقاء ملتا ہے۔

"معصومہ" ناول ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا۔ یہ ایک معصوم لڑکی کی بربادی کی کہانی ہے جو بچپن میں اپنے گھر والوں بھائی بہنوں اور والدین کی بہت دلاری تھی اور آخر میں اپنے گھر والوں کی بہتری کے لئے ایک طوائف بن جاتی ہے۔ یہ کہانی تقسیم ہند کے دوران کی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ معصومہ کے والد اپنے خاندان کو ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان چلے جاتے ہیں کہ وہاں نوکری حاصل کر لینے کے بعد گھر کے باقی افراد کو بھی وہیں بلا لیں گے لیکن معصومہ کے والد نے پاکستان جا کر ایک نوعمر لڑکی سے شادی کر لی اور گھر والوں کو پاکستان نہ بلایا۔ ادھر یہ خاندان کچھ برس حیدر آباد میں رہنے کے بعد بمبئی آ جاتا ہے۔ یہاں مفلسی میں دن کٹتے رہے کہ پہلے زیورات بکے اب نوبت گھر کے سامان بیچنے کی آگئی تھی تبھی ان لوگوں کی ملاقات "احسان صاحب"

سے ہوتی ہے ان کی نظر معصومہ کی جوانی پر پڑتی ہے اس کی خوبصورتی کی وجہ سے احسان صاحب اسے فلم کی ہیروئن بنانا چاہتے تھے۔ جب معصومہ کے گھر میں فاقے ہونے لگتے ہیں تو اس نازک موقعہ پر احسان صاحب ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور معصومہ اور انکی والدہ کی ملاقات "احمد بھائی" سے کرا دیتے ہیں جو عیاش قسم کا آدمی ہے اور کئی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے اس کی نیت خراب ہے وہ معصومہ کی وجہ سے اس کے گھر والوں کی مدد کرتا ہے ایک روز معصومہ کی ماں احمد بھائی کا منشا جان لیتی ہے مگر کچھ کہہ نہیں پاتی کیونکہ انہیں اپنی اور لڑکیوں کی پرورش کرنی تھی ان کا لڑکا ابھی چھوٹا تھا۔ احسان صاحب شہرت کے بھوکے تھے وہ احمد بھائی جو ایک مالدار شخص کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فلم بنانا چاہتے تھے جس کی ہیروئن وہ معصومہ کو بنانے کے خواہش مند تھے۔ اس طرح معصومہ احمد بھائی، احسان صاحب راجہ صاحب اور ان کے جیسے کئی لوگوں کی وجہ سے طوائف بن جاتی ہے مگر اسکی نسوانیت پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔

اس ناول میں عصمت نے سماجی طبقاتی شعور کے ساتھ گناہ میں جکڑی ہوئی لڑکی کی کرب ناک داستان پیش کی ہے نوابین کے خاتمے کے بعد اس خاندان پر کیا گزری یہ اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ کہانی اس زمانے کے لٹے پٹے مفلس اور بے کس خاندان کی کہانی ہے۔

اس ناول میں عصمت انسانی نفسیات کی بہت سی خرابیوں کو بھوک سے تعبیر کرتی ہیں جنس کی بھوک، روٹی کی بھوک، شہرت کی بھوک عزت اور دولت کی بھوک وغیرہ۔ اس کائنات کی اچھائی اور برائی اس بھوک سے وابستہ ہے۔ ہر عورت کا زیور عزت،، کہنے والی ماں نے اپنی اور بچوں کی بھوک کی خاطر اپنی بیٹی کو ایک بڈھے شخص کے ہاتھ کچھ روپے کی خاطر فروخت کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی زمین بچا سکے، ایک گائے خرید سکے۔ ؟

معصومہ میں ایک ماں اپنی بیٹی کو اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کے لئے بیچ دیتی ہے تاکہ گھر کی جھوٹی شان قائم رہ سکے، ان کے بچے اسکولوں میں اچھی تعلیم حاصل کر سکیں وہ معصومہ سے کہتی ہیں

"تجھے قربانی دینی ہوگی چھوٹے بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگانے کیلئے پتوار بننا ہوگا۔"[1]

---

[1] معصومہ عصمت چغتائی ص ۲۴

اس ماں نے خود اپنی پاک دامن معصوم بھولی سی لڑکی کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔ گویا عورت اگر بیچی نہ جائے وہ اپنے جسم کا استعمال نہ کرے تو گھر کا خرچ نہیں چلا سکتی۔

اس ناول کی زبان بمبئی کی زبان ہے اور فلمی ماحول کی عصمت چغتائی نے بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد جہاں سماج سے نفرت ہوتی ہے وہیں معصومہ سے ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ عصمت نے زیادہ تر ناولوں میں سماج کو "ولین" بنا کر پیش کیا ہے۔

معصومہ کا کردار اس ناول میں پلاٹ اور کہانی یا پھر موضوع سب سے اہم ہے، یہ ایک مسلم متوسط خاندان کی لڑکی ہے تین بھائیوں کے بعد اس کی پیدائش گھر میں خوشی کا ماحول بنا دیتی ہے۔ اس کے گھر والے مذہبی ہیں۔ اور اس کا نام بھی قرآن شریف دیکھ کر رکھا گیا تھا۔ مذہبی تعلیم اسے بچپن سے دی گئی۔ انیس۱۹ بیس۲۰ برس تک اس کی زندگی بڑے سکون کے ساتھ اخلاقی مذہبی اور علمی ماحول کے زیر اثر گزری اس کے ادبی ذوق کا بیان عصمت یوں کرتی ہیں

> "اسے شیلے سے عشق تھا اور کیٹس پر دم جاتا تھا۔ بائرن کے نام پر دل دھڑکنے لگتا تھا۔ ـــــــ" [1]

ان شاعروں کے پسند کرنے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور جذباتی لڑکی تھی۔ اس کا ذہن بہت جلد ہر نئی چیز کی طرف مائل ہو جاتا تھا، وہ "ولایت" جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کے علمی ذوق کو تسکین حاصل ہو۔ مگر حیدرآباد سے بمبئی آنے کے بعد اس کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں کیونکہ خود اس کی ماں نے دلال بن کر اسے اپنے عیش و آرام کے لئے طوائف بننے پر مجبور کیا ایک خاص بات جو ہم نے عصمت کی ناولوں میں محسوس کی ہے کہ عصمت کے ناولوں میں عام طور سے ماں کا کردار یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو نہایت غیر ذمے دار ماں کا کردار ابھرتا ہے۔ یہاں بھی معصومہ صرف اپنی ماں کی وجہ سے بربادی کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور ہوئی۔

ایک معصوم لڑکی جو کہیں بھی نوکری کر سکتی تھی پڑھی لکھی سمجھ دار تھی ماں نے اسے ایسی

---

[1] معصومہ عصمت چغتائی ص ۱۵۴

راہ دکھائی جو بری ہے جہاں صرف بدنامی اور ذلّت ہے۔ احمد بھائی اور اس کی ماں نے معصومہ کو طوائف تو بنا دیا مگر وہ بازار حسن میں پہنچ کر بھی بالکل بازاری نہ بن پائی۔ معصومہ کو اپنے چھوٹے بھائی بہن کی تعلیم کا ہمیشہ خیال رہتا اور وہ بار بار تعلیم کے فائدہ کی طرف اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو راغب کرتی ہے۔ خود بھی اس 'دلال' سے نکلنا چاہتی ہے مگر اہل خاندان کا خیال کر کے نکل نہیں پاتی۔ وہ اپنے آپ کو مٹا کر بھی اپنے خاندان والوں کو خوش دیکھنے کی خواہش مند نظر آتی ہے۔

معصومہ اپنی بہن کی شادی میں سورج مل۔ احمد بھائی اور سبھی کو بلاتی ہے اور اس طرح زندگی سے سمجھوتہ کرنے والا ایک کردار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے کردار میں ارتقاء ملتا ہے۔

عصمت نے اس کردار (معصومہ) کے ذریعہ سماج کے نام نہاد مکروہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ احمد بھائی مکاری اور چاپلوسی سورج مل کا کالا بازاری راجہ صاحب کی سماج سیوا سب کی ایک ایک پرت اتار کر عصمت نے انہیں بے نقاب کیا ہے۔ مجموعی طور پر عصمت چغتائی کا یہ ناول ان کے پہلے ناول کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں جہاں فکری لحاظ سے گہرائی نظر آتی ہے وہیں فنی لحاظ سے پختگی بھی ملتی ہے۔ "ضدی" میں جذباتیت کا وفور اس کی کمزوری بن کر ابھرا تھا لیکن معصومہ میں جذباتیت کے ساتھ بالغ نظری بھی ملتی ہے جس نے ناول کو ایک معیار عطا کر دیا ہے۔

"سودائی"، ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اگر فلم "بزدل"، دیکھنے کے بعد اس ناولٹ کو پڑھا جائے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئے گی۔ اس کا پلاٹ اور کردار سبھی پر فلمی انداز حاوی ہے۔ سورج چندر کا بڑا بھائی ہے۔ چاندنی ان دونوں کی مشترکہ محبوبہ ہے مگر وہ پیار چندر سے کرتی ہے۔ اودرا دشا اور چندر سورج کو ایک دیوتا کی طرح مانتے ہیں اس کی پرورش ایک خاص اہتمام سے کی گئی ہے صبح و شام اس کی آرتی اتاری جاتی ہے اودرادشا جو اس کی منگیتر بھی ہے اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے سب اس کو دیوتا کی طرح پوجتے ہیں مگر کوئی اس کے اندر کی تبدیلی اور ابلتے ہوئے جذبات کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کرتا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ اس کی پوجا ہوتی ہے اس لئے وہ عام بچوں کی طرح نہیں رہ پاتا ہے۔ اپنی جوانی کے اٹھتے طوفان کو وہ چاندنی سے محبت کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ وہ چاندنی کو نہاتا دیکھنے کے لئے غسل خانے کے شیشے کی وارنش کھرچ دیتا ہے۔ اور ایک روز وہ خود پر سے قابو کھو بیٹھتا ہے اور کھڑکی سے اس کے کمرے میں جانے لگتا ہے۔ سورج کی جان بچانے کے لئے وہ چاندنی کو رائے دیتی ہے کہ تم زہر کھا کر مر جاؤ مگر ہوتا اس کا الٹا ہے زہر سورج کھا لیتا ہے اور کہانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سودائی میں عصمت نے مثالی اور جذباتی کردار پیش کئے ہیں اوشا رانی کا کردار بالکل میرا بائی سے ملتا جلتا ہے جن کو بچپن میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ "کرشن جی" تمہارے پتی ہیں اور تا زندگی انہیں اپنا شوہر مانتی رہو۔ عصمت نے چندر کے منہ سے جو مکالمے بیان کروائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ ان مکالموں سے نہ صرف اوشا کے کردار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ عصمت کا عورتوں کے لئے کیا نظریہ ہے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے رسم و رواج کے خلاف ہندوستانی عورت کی بغاوت اور اس کی ذہنی تبدیلی کا پتہ بھی چلتا ہے۔

چندر کا کردار ترقی پسند ہے وہ نہ صرف چاندنی جیسی لاوارث لڑکی سے پیار کرتا ہے بلکہ بیاہ بھی کر لیتا ہے وہ سورج بڑے سرکار کی طرح صرف لکچر بازی میں یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی چھپ چھپ کر غلط حرکت ہی کرتا ہے۔ بلکہ ہمت سے سماج کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ کردار اپنی ارتقائی منزل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے مجموعی طور پر یہ ناول ایک دلچسپ نفسیاتی ناول ہے جو عصمت کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں فنی طور پر کمزور ہے۔ غالباً اسی لئے پروفیسر عبدالسلام نے اپنی کتاب "اردو ناول بیسویں صدی میں" میں تبصرہ کرتے ہوئے "سودائی" کو عصمت چغتائی کا سب سے گھٹیا ناول قرار دیا ہے۔ [1]

دل کی دنیا

"دل کی دنیا" ایک ایسا ناول ہے جیسے "لحاف"۔ اس کی کہانی بھی ایک بچی رقیہ حسن کے مشاہدات کے طور پر بیان کی گئی۔ قدسیہ اس ناول کی ہیروئن ہے جس کی

[1] اردو ناول بیسویں صدی میں ۔ عبدالسلام

شادی باقر حسین کے ساتھ پندرہ برس کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ چھ ماہ کے بعد باقر حسین ولایت چلا جاتا ہے اور پھر دو سال تک خط وکتابت چلنے کے بعد یہ سلسلہ بھی بند کر دیتا ہے جب وہ ولایت سے واپس آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور پھر یہ لوگ واپس آکر ہندوستان میں بس جاتے ہیں۔ یہ قصہ شادی کے دس سال بعد شروع ہوتا ہے۔ آخر میں قدسیہ اپنے رشتہ دار شبیر حسن کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور دونوں ولایت میں جاکر بس جاتے ہیں ان کی بیٹی رقیہ حسن ان کے مزار کی داستان بیان کرتی ہے۔

قدسیہ کے شوہر کی دوسری شادی کے بعد قدسیہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہے۔ اس لئے وہ اپنا دل نیم دیوانی "بوا" کے گانے کو سن کر بہلاتی ہے بوا بھی قدسیہ کی طرح بد نصیبی کا شکار تھی اس کی شادی کے بعد جب برات ندی پار کر رہی تھی سوائے بُوا کے سب ڈوب کر مر گئے تھے۔ تبھی سے بوا نیم پاگل سی ہو گئی تھی بوا کے سلگتے گانے اور سریلی آواز سے قدسیہ کا جوان جسم سلگنے لگتا اس کی اس نفسیات کو گھر والے سمجھ نہیں پاتے۔ یہ متوسط گھرانے کی کہانی ہے۔ اس ناول میں جنسی جذبات کا بیان ہے۔

ایک جگہ عصمت لکھتی ہیں کہ مرد سے زیادہ عورت کے لئے جنسی جذبہ ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کے یہاں یہ مسئلہ بن جاتا ہے مرد اپنے جنسی جذبے کی تسکین باہر جاکر پوری کر لیتا ہے مگر عورت کیا کرے کہاں جائے۔ اس ناول میں ایک کردار بچا مستقیم عرف "مچھو" ہے جو بے روک ٹوک طوائفوں کے یہاں جاتے ہیں۔ قدسیہ چونکہ اپنے جذبات کا نہ تو بیان کر پاتی ہے نہ تسکین ہی اس لئے بڑی بے چین رہتی ہے۔ اس کی نانی اس کی بے چینی کو کوئی بیماری سمجھتی ہے اور اسے مذہب اور عبادت کی طرف مائل کرتی ہے۔ لیکن ان سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ قدسیہ خوب جانتی ہے کہ اس کے مرض کا علاج نماز روزہ یا جلاب نہیں بلکہ وہ اپنے علاج کو شبیر حسن (جو اس کا دیور ہے) میں دیکھتی ہے مگر وہ ایک دبو شخص ہے جو صرف دور دور سے جذبات تو بھڑکاتا ہے مگر اس کے بعد کچھ نہیں کرتا۔ شبیر حسن کے پاس قدسیہ کی بیماری کا علاج تھا مگر وہ کمزور

مرد ہے جو کھل کر عشق کا اظہار کرنا بھی نہیں جانتا۔ آخر کار قدسیہ اس سے بھی بور ہو گئی ساری دنیا سے اس کا جی اچٹ گیا وہ بیزار اور بے بس مایوس زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی، مگر اسی موقعہ پر اس کے چچا مستقیم اسے ایک نئی راہ دکھاتے ہیں کیونکہ وہ قدسیہ کی بیماری کو خوب سمجھتے تھے اور اس کا علاج بھی جانتے تھے۔ ان کی باتوں سے قدسیہ کو بڑا حوصلہ ملتا ہے اور وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے اس ناولٹ کے بارے میں زرینہ عقیل کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔

"اشتراکی نقطۂ نظر سے عصمت کا ناول" دل کی دنیا"، کو اس لئے کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ اس میں عورت نے نئی زندگی اور نئی قدروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت کی ہے فرسودہ خاندانی روایات کو بے جگری کے ساتھ توڑا ہے۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیتوں سے، اپنی جدوجہد اور محنت سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہیئے اور عصمت نے ان سبھی چیزوں کو قدسیہ بیگم کے کردار میں سمو کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ [1]

" باندی" ناول میں عصمت نے متوسط طبقے سے ہٹکر نوابین کا ذکر کیا ہے۔ یہاں انہوں نے شیعہ مذہب سے تعلق رکھنے والے گھرانے کی تصویر پیش کی ہے۔ جہاں باندیوں کا استعمال نواب زادوں کے عیش و آرام کا ایک حصہ تھا۔ اور اس بات کو وہ لوگ وقار اور اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اس ناولٹ کا موضوع ہے " باندی"، جو کبھی تو نوابوں کا بستر گرم کرتی ہے تو کبھی خدمت

یہ ناول بھی نفسیاتی ناول کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ نایاب باندی کنوارے پن میں ماں بن جاتی ہے مگر بیوی بننے کی تمنا دل میں لئے رہتی ہے۔ اور اس چیز کا بدلہ وہ اس طرح لیتی ہے کہ دوسری کمسن باندیوں کو سجا سنوار کر نوابوں کے جوان لڑکوں کی خواب گاہ میں چوری چھپے پہنچا دیتی ہے۔ اب یہی اس کا پیشہ بن جاتا ہے۔ وہ حساس طبیعت کی لڑکی تھی بعد میں وہ کئی بار اس ماحول سے نکلنے کی کوشش بھی کرتی ہے مگر اپنے بیٹے جبار کی

[1] اردو ناول میں سوشلزم ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد ص ۴۹۶

زندگی بنانے کی غرض سے اسی گھر میں رہتی ہے۔ وہ بار بار "جبار" کو نواب کا حقیقی بیٹا تصور کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ اس کو بھی نوابوں کے بیٹے جیسا وقار ملے۔

نوابوں کے دور میں عورت ان کے ہاتھ کا کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ یہاں عورت کو اپنا کوئی مقام حاصل نہ تھا اگر وہ بیوی تھی تو صرف بچوں کی ماں کہلانے گھر بار چلانے کے لئے۔ باندیاں اور طوائفیں صرف امیر مردوں کا دل بہلانے کے لئے جن کے پاس پیسہ تھا دولت تھی۔ اس ناول میں مکالموں کے ذریعہ عصمت نے اس خیال کی نقاب کشائی کی ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں بدی اور برائی کو جائز رکھنے کے لئے مذہب کا جھوٹا سہارا لیا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی نوابوں کے یہاں ایماندار اور حقیقت پسند لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں چھمن میاں اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ نواب زادے تو تھے مگر نوابی مزاج اور فضا ان کو برداشت نہیں ہے وہ بوسیدہ رسم و رواج جھوٹی شان اور بے مروّت دنیا کو جھوٹ کے جال سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ وہ نئی تعلیم کے پروردہ تھے وہ باندی کے جسم کو تصرف میں لانے کے خلاف ہیں اور اس رسم قبیح کو توڑ کر افلاس کی زندگی بتاتے ہیں۔ وہ باندی کے ساتھ عیاشی نہیں کرتے بلکہ جب وہ ایک باندی سے ملتے ہیں تو اسے باندی سے بیوی بنا لیتے ہیں دن رات سارے گھر والے اُن کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں مگر وہ نہیں مانتے اور اپنی بیوی کی خاطر ساری دولت اور خاندان کو الوداع کہہ دیتے ہیں۔

بیوی کے ساتھ وہ شہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں نئی زندگی شروع کرتے ہیں۔ وہ سماج سوسائٹی اور رسم و رواج کے خلاف کھڑے ہو کر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر "باندی" اوسط درجے کا ناول ہے جس میں نوابوں کی عیاشی اور غریبوں کی مجبوری کے پہلو بہ پہلو نئی سماجی بیداری اور جد و جہد کو بھی پیش کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کی خوبی ہے۔

جنگلی کبوتر

"جنگلی کبوتر" بھی ایک نفسیاتی ناولٹ ہے اس میں عصمت نے انسانی شعور اور جنسی جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ناول کا ہیرو باجد اپنے معاشقوں کے لئے مشہور ہے اس کے نام کے ساتھ خاندان کی کئی لڑکیوں کا نام جوڑا جاتا ہے رشتہ دار لڑکیاں بڑے

مزے لے لے کر اس کا ذکر ایک دوسرے سے کرتی ہیں۔ اپنے ہی رشتہ داروں میں ایک لڑکی عابدہ سے ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عابدہ اپنے خاوند کی کمزوری سے واقف ہونے کے باوجود اس سے شدید محبت کرتی ہے اور اس طرح ماجد بھی تمام دیگر خرافات کو چھوڑ کر عابدہ کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بد قسمتی سے عابدہ بانجھ ثابت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود بھی وہ دونوں میاں بیوی خوش رہتے ہیں۔

اس ناول کی ابتدا، ماجد کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ عابدہ اپنی یادوں کے سہارے تمام زندگی کے ازدواجی سفر کو محسوس کرنا شروع کرتی ہے۔ اپنے پلنگ پر خاوند کا حصہ خالی دیکھ کر وہ خیالوں میں ڈوب جاتی ہے۔ شادی کے چند سال بعد عابدہ اپنے خاوند کی اصلاح کا ایک نیا نفسیاتی طریقہ اختیار کرنے کی غرض سے بار بار میکے چلی جاتی ہے اور اپنی غیر موجودگی سے ماجد کے صبر و برداشت کو تقویت دینا چاہتی ہے اور ماجد کے بار بار بلانے پر بھی واپس جلدی نہیں آتی۔ اور آخر میں اس طویل غیر حاضری نے ماجد کے صبر کو توڑ دیا اور وہ جنسی آسودگی کے لئے ایک لڑکی مونا سے دوستی کر لیتا ہے اور وہ ماجد سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ عابدہ واپس گھر آتی ہے اور اپنی چیزوں کو غائب پاتی ہے اس دوران اسے ماجد کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں وہ ماجد سے تو کچھ نہیں کہتی مگر خود مونا سے ملنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر عابدہ ان باتوں سے بے خبر مونا کے ہونے والے بچّہ کے لئے فکر مند ہے۔ جبکہ ماجد بار بار اپنی مجبوری اور صفائی دیتا ہے۔

"جان من دنیا کی یہ سب سے بھیانک بیماری ہے۔ اس نے بڑے بڑے مہارشیوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ ـــــ" [1]

اُدھر ماجد اپنے کیئے پر بہت پریشان اور شرمندہ ہے بار بار معافی مانگتا ہے اور عابدہ کے جسم کی قربت کے لئے ترستا ہے۔ مگر بار بار اختلاط کے نفسیاتی مرحلے کے قریب آ کر وہ ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

"میرا جسم تمہارے لمس کے لئے سسک رہا ہے۔ نہ جانے کیں

---

[1] جنگلی کبوتر عصمت چغتائی ص ۲۲

کیا ہوتا ہے شاید کمتری کے احساس سے جھجھک کر مفلوج ہو جاتا ہے۔[1]

عابدہ پہلے مونا اور اس کی بچی کا خرچ کھلم کھلا دیتی ہے مگر پھر ماجد سے چھپا کر اس کا خرچ پورا کرتی ہے وہ چاہتی ہے کہ مونا بچی کو عابدہ کو دے دے تاکہ بچی کی زندگی بہتر گزر سکے مگر جب وہ بچی دینے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر عابدہ خرچ دینا بند کر دیتی ہے۔

ماجد تمام ناول میں میاں بیوی کے رشتے کو بہتر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے مگر عابدہ کا جسم باوجود اس سے محبت کرنے کے ماجد کے جسم کو قبول نہیں کرتا۔ عابدہ ذہنی طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ جس بھروسہ اور یقین کو اس نے اپنے اور ماجد کے درمیان قائم کرنے کی کوشش کی تھی وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ ماجد خود نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان تھا وہ جب بھی عابدہ کے پاس جاتا ہے ذہن اور جسم میں جنگ شروع ہو جاتی ہے شعور میں چھپا ہوا احساس جرم اس کے جسم کو اپاہج کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور دوسری طرف عابدہ کا دل بے اعتباری اور کراہیت کے بوجھ سے دبا سا رہتا تھا۔ عابدہ کو اپنی محبت کا واسطہ دیتا ہے۔ مگر عابدہ جیسے ہی ماجد کے پاس آتی ہے اسے "جھوٹی رکابی" کا تصور آ گھیرتا ہے۔ ماجد بہت کوشش کرتا ہے کہ دونوں پھر مل جائیں مگر ناکامیابی ہی ہاتھ آتی ہے۔ آخر میں ماجد طنز سے اس کے خلوص اور محبت کا مذاق بھی اڑاتا ہے عابدہ ماجد کی حرکت کو ناقابل معافی مانتی ہے تب وہ ایک مثال دیتی ہے وہ ایک گلاس توڑ کر کہتی ہے کہ کیا تم ان شیشوں کو آپس میں جوڑ سکتے ہو؟ نہیں نا اس طرح ہم بھی کبھی نہیں مل سکتے۔ ماجد عابدہ کو یاد دلاتا ہے کہ پہلے ہم کتنے خوش تھے ہر وقت ہنسی مذاق کیا کرتے تھے ماجد عابدہ کو چھیڑا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی عابدہ شوہر سے تعلق قائم نہ کر پائی۔

پورا ناولٹ ایک ذہنی اور جسمانی کشمکش کے درمیان الجھا رہتا ہے۔ عابدہ بانجھ پن کے باعث احساس کمتری کی شکار ہے اور اسی نفسیاتی الجھن کے تحت وہ ماجد کو معاف نہیں کر پاتی اور ادھر ماجد اپنی غلطی کی تلافی پیار کر کے کرنا چاہتا ہے مگر دو جسم ایک جان نہیں

---

[1] جنگلی کبوتر   عصمت چغتائی   ص ۶۳

بن جاتے کیونکہ جب جسم پاس آتا ہے تو روح کچوکتی ہے اور جب روح ملامت کرتی ہے تو جسم قریب آنے سے گھبراتا ہے۔

ادھر مونا اپنے اور بچی کو پالنے کے لیئے جسم کا سودا کرتی ہے وہ سماج میں ایک ماں اور ایک بیوی تو بن نہیں پاتی تھی لہذا اس نے بچے کو عابدہ کو دیدیا تاکہ وہ عزت کی زندگی گزار سکے۔

آخر میں ایک لمبی بیماری اور نوکری چھوڑنے کے بعد ماجد اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں مونا کی بچی اس کی خالی جگہ لے لیتی ہے۔ اس وقت اس کا ذہن اور روح دونوں نیند میں ہے۔

عصمت کا یہ ناولٹ مکمل طور پر نفسیاتی ناولٹ ہے۔ جس میں مرد عورت کے نفسیاتی کوائف کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ نفسیاتی کشمکش اس ناول کی ایک دوسری خوبی ہے جس کی پیش کش میں عصمت چغتائی نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے

"عجیب آدمی"، عصمت کا ایک مختصر ناول ہے۔ جو ان کے دیگر ناولوں کی طرح فلمی دنیا کے اردگرد گھومتا نظر آتا ہے۔ عجیب آدمی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو شروع میں مفلس تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کرتا گیا اور کافی مالدار آدمی بن گیا اور یہیں سے اس کے کردار کی کجروی شروع ہوتی ہے۔

اس ناول کا ہیرو دھرم دیو ہے جو شروع میں نہایت جھینپو سا کم عمر لڑکا تھا وہ اور اس کے دوست فلمی دنیا میں اپنی قسمت آزما رہے تھے وہ بمبئی ٹاکیز کے احاطے میں بیٹھ کر اکثر ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ یہیں اس کی ملاقات منگلا نام کی ایک لڑکی سے ہوجاتی ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک عاشق مزاج آدمی ہے اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوجاتی ہے اور پھر دھرم دیو کی شادی منگلا سے ہوجاتی ہے۔ دھرم دیو چونکہ ذہین اور محنتی آدمی تھا اس لئے آگے چل کر وہ بڑا ڈائرکٹر اور پروڈیوسر بن جاتا ہے اور اپنی ذاتی فلمی کمپنی قائم کرتا ہے اور ایک بڑے سرمایہ دار شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

دھرم دیو طبعاً عاشق مزاج واقع ہوا ہے اس لئے وہ کئی لڑکیوں سے عشق کرتا ہے حالانکہ اب منگلا اس کی زندگی میں آگئی تھی پھر بھی وہ اپنی افتاد طبع سے مجبور ہوکر ریتا نام کی ایک لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے مگر جلد ہی ریتا کی شادی ہوجاتی ہے

منگلا پھر بھی دھرم دیو کے بارے میں جاسوسی کرواتی رہتی ہے کہ کہیں وہ عشق تو نہیں کر رہا ہے۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ جس زرینہ نام کی لڑکی کو وہ اپنی چھوٹی بہن بنا کر گھر میں رکھے ہوئے ہے وہی اس کی سوت ہے منگلا تو اُسے بہت پیار کرتی تھی۔ بمبئی کی زندگی کے بارے میں اُسے سمجھایا کرتی تھی بچے بھی اُس سے بہت مانوس ہو گئے تھے پہلے منگلا کو دھرم دیو پر شک ہوتا ہے۔ بعد میں یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے اور اپنے غم کو بھلانے کے لئے شراب کا سہارا لیتی ہے۔ اُدھر دھرم دیو بھی زرینہ کے عشق میں ناکام ہو کر خود کشی کی کوشش کرتا ہے مگر خوش قسمتی سے بچ جاتا ہے اور پھر زرینہ کی طرف لوٹنا چاہتا ہے مگر دو عورتوں کی محبت کے چکر میں وہ کسی کا بھی نہیں ہو پاتا اور بالآخر مایوس ہو کر اپنی زندگی ختم کر لیتا ہے۔

"عجیب آدمی" مجموعی طور پر ایک اوسط درجے کا ناول ہے جس میں مرد کی فطرت اور اس کی ذہنی کش مکش کا فنکارانہ اظہار خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔

"ایک قطرہ خون" عصمت چغتائی کا ایک ایسا ناول ہے جو واقعہ کربلا پر لکھا گیا ہے یہ ناول عصمت نے میر انیس کے مرثیوں سے متاثر ہو کر لکھا ہے جیسا کہ وہ خود لکھتی ہیں کہ

"انیس کے نام"، یہ کہانی میں نے ان کے مرثیوں میں پائی ہے ـــ"[۱]

اس ناول میں عصمت نے کربلا کے تاریخی واقعے کو ناول کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ناول کے ہیرو کربلا کے وہ بہتر (۷۲) شہداء ہیں جنہوں نے حق کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر باطل کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا۔ اس ناول کے "پیش لفظ" میں عصمت لکھتی ہیں۔

> "یہ ان بہتر انسانوں کی کہانی ہے جنہوں نے انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکر لی۔
> یہ چودہ سو سال پرانی کہانی آج کی کہانی ہے کہ آج بھی انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان کہلاتا ہے۔

---

[۱] ایک قطرہ خون ‌‌ عصمت چغتائی ‌ ص ۱

آج بھی انسانیت کا علم بردار انسان ہے۔ آج بھی جب دنیا کے کسی کونے میں کوئی یزید سر اٹھاتا ہے تو حسینؑ بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دیتے ہیں آج بھی اُجالا اندھیرے سے بر سرِ پیکار ہے ــــ،، [1]

اس ناول میں عصمت نے کوئی نئی کہانی کوئی نیا پلاٹ پیش نہیں کیا ہے بلکہ میر انیسؔ کے مرثیوں کو ناول کی شکل میں بیان کر دیا ہے واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے تاہم اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسے عصمت چغتائی نے لکھا ہے انیسؔ کے یہاں سانحہ کربلا کا بیان الگ الگ مرثیوں میں ملتا ہے۔ لیکن اس ناول میں اسے سلسلے دار پیش کیا گیا ہے۔ اس کام میں عصمت خاصی کامیاب ہوئی ہیں۔ انہوں نے مختلف مرثیوں میں بیان کردہ واقعات کو جس حُسنِ خوبی سے اپنے ناول میں پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ بقول ڈاکٹر شارب ردولوی

"وہ تمام واقعات جو انیسؔ کے مرثیوں میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل اور کہیں صرف اشاروں میں آئے ہیں۔ انہیں ترتیب دیکر مفصل طور پر بیان کرنے کی ضرورت تھی جسے عصمت چغتائی نے پورا کر کے ایک بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ ــــ،، [2]

مرثیوں میں اکثر واقعات کو مختصر کر کے اور کچھ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے مگر عصمت نے ان سبھی واقعات کو چاہے وہ امام حسینؓ کے بچپن کے ہوں چاہے میدان کربلا کی جنگ سے متعلق ہوں حُر کی بیوی کا حرم میں کھانا لے کر جانے کا واقعہ ہو یا حضرت علی اصغرؓ اور امام حسینؓ کی شہادت ہو یا نصیحتیں ہوں۔ اک ہی عصمت نے بچپن کے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے حضرت امام حسنؓ کا بچپن گھوم جاتا ہے وہ عام بچوں کی طرح ضد کرتے ہیں اپنی باتیں منواتے ہیں، نانا سے بھائی کی شکایت کرتے ہیں یہاں سے لے کر آخر میں کربلا کے میدان جنگ میں امام کی لڑائی کا منظر ایسا بیان کیا ہے کہ

---

[1] ایک قطرہ خون — عصمت چغتائی — ص بپیش لفظ

[2] تنقیدی مطالعہ — شارب ردولوی — ص ۲۲۳

آنکھوں کے سامنے سارا منظر گھوم جاتا ہے۔ یہ عصمت کے زورِ قلم کا جادو ہی ہے مرثیوں کے ان بکھرے ہوئے خیالات اور واقعات کو عصمت نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ کہیں بھی تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا اور قاری خود کو ان کے قلم کے طلسم میں اسیر پاتا ہے۔ ناول کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے مراثی انیس کی تشبیہات اور استعارات کا استعمال نہایت خوبی سے ہوا ہے۔

اکثر جگہوں پر تو پورے پورے مصرعے نقل کر دیے گئے ہیں۔ مگر اس خوبی کے ساتھ کہ یہ عیب لگنے کے بجائے اور بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور ناول کی دلچسپی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

"ایک قطرہ خون" میں جذبات نگاری کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ باپ بیٹی کا رشتہ، شوہر بیوی کا رشتہ۔ بہن بھائی کا رشتہ اور بیٹی اور ماں کے رشتہ کو جس خوبصورتی کے ساتھ عصمت نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اکثر جگہوں پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں شارب ردولوی ایک قطرہ خون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں (عصمت چغتائی) نے کسی جگہ بھی اس عظیم قربانی کے انسانی اور اخلاقی مقصد کو کم نہیں ہونے دیا ہے۔ ۔۔۔" [1]

ان خوبیوں سے قطع نظر اس ناول میں کہیں کہیں جھول بھی نظر آتا ہے ایک دو جگہ تاریخی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک جگہ تو وہ ہے کہ جہاں عصمت نے علی اصغر کو چھے سال کا بچہ بتایا ہے۔ اور دوسری جگہ آپ نے محرم کی چار تاریخ سے پانی کے بند ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔

حدیث اور عقیدے کے مطابق علی اصغر چھے سال کے بچے نہیں بلکہ چھے مہینے کے بچے تھے اور محرم کی چار تاریخ سے نہیں بلکہ سات محرم سے پانی بند ہوا تھا۔

---

(۱) تنقیدی مطالعہ شارب ردولوی ص ۲۲۹

ٹیڑھی لکیر میں قِصّہ اور پلاٹ

ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں پلاٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

پلاٹ کی ذیل میں آغاز وسط اور اختتام ہونا چاہیئے "آغاز" وہ ہے جو لازمی طور پر کسی دوسری چیز کے بعد نہیں آتا حالانکہ کوئی اور چیز موجود ہوتی ہے یا اس کے بعد آتی ہے۔ برخلاف اس کے "خاتمہ" وہ ہے جو ضروری یا عام نتیجہ کے طور پر کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور نہیں آتا "وسط" وہ ہے جو کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد بھی کوئی چیز آتی ہے۔ [1]

کسی واقعہ کو بیان کرنے کے لئے پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کسی واقع کو کس طرح پیش کریں اس میں کہاں دلچسپیاں پیدا کریں اور کس انداز سے کہانی کی شروعات کریں۔ ناظرین کی دلچسپی کس کس جگہ بڑھائیں جس سے قصہ موثر ہو اور قارئین کو دلچسپ لگے۔ "ناول کا فن" میں ای۔ایم فارسٹر پلاٹ اور کہانی کا جو فرق بتاتے ہیں وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پلاٹ بھی واقعات ہی کا بیان ہے مگر اس میں اسباب و عمل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے ــــــ "بادشاہ مرا اور پھر ملکہ مر گئی"، یہ ایک کہانی ہے۔ بادشاہ مرا اور پھر اس کی موت کے غم میں ملکہ مر گئی"، یہ ایک پلاٹ ہے۔ ــــــ " [2]

گویا اگر "ٹیڑھی لکیر" کے پلاٹ پر بات کریں گے تو یہ بات بھی صاف ہونی چاہیئے کہ شمن کے کردار کی کجروی اور نفسیاتی الجھنوں کی وجہ کیا ہے۔ یعنی صرف واقعے کے بیان سے کام نہیں چلے گا

[1] ارسطو سے ایلیٹ تک — ڈاکٹر جمیل جالبی — ص ۱۰۰ - ۹۹
[2] ناول کا فن ای ایم - فارسٹر — ترجمہ ابوالکلام قاسمی — ص ۶۳ - ۶۲

بلکہ اس کی وجہ پر بھی توجہ دینی ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ـــــ "پلاٹ کا خالق ہم سے واقعات کو یاد رکھنے کی امید رکھتا ہے اور ہم اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کوئی سرا ڈھیلا نہ چھوڑے گا ـــــ"۔ [1]

اس لئے نہ پلاٹ بہت لمبا چوڑا ہو کہ کہانی بھول جائے اور کردار کو یاد رکھنے میں دقت ہو۔ پلاٹ کے معاملے میں پریم چند کا "گؤدان" بہت پیچیدہ ہے جس میں چند کرداروں کے علاوہ سبھی آپس میں مل جاتے ہیں اور واقعے کو یاد رکھنے میں پریشانی ہوتی ہے مگر "ٹیڑھی لکیر" کا پلاٹ طویل ہونے کے باوجود الجھا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر واقعہ ایک علیحدہ افسانہ کی طرح دلچسپ اور ایک زنجیر کی طرح آپس میں ملا ہوا ہے۔ حالانکہ کردار بہت زیادہ ہیں مگر سب بہت جلدی اپنا اپنا کام کر کے معدوم ہو جاتے ہیں ڈاکٹر محمد حسن فاروقی کے نزدیک پلاٹ دو طرح کا ہوتا ہے ایک "ڈھیلا" دوسرا "گٹھا" ہوا

"اوّل میں متعدد قسم کے واقعات ایک ہی شخص سے متعلق ہوتے ہیں اور ان واقعات میں ایک دوسرے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔

دوسرے میں (گٹھا ہوا پلاٹ) ایک واقعہ دوسرے سے اس طرح منسلک رہتا ہے جیسے ایک مشین کے مختلف پرزے۔ اچھے ناولوں میں عموماً توازن ترتیب اور ہیئت کا خیال رکھا جاتا ہے اور پلاٹ کو بھی کافی لچکدار بنا دیا جاتا ہے ورنہ مکمل طور پر گٹھا ہوا پلاٹ تو محض ریاضی کا فارمولا ہو کر رہ جائے گا حقیقت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ غور سے بنایا ہوا پلاٹ میکانکی ہو جاتا ہے۔ اس میں آورد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قصہ بالکل گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے بڑے ناول نگاروں کے پلاٹ تمام تر بے حد گٹھے ہوئے نہیں ہوتے اور کسی ناول میں پلاٹ کا گٹھا ہوا ہونا۔ اس کی تعریف بھی نہیں ہوتی ضروری بات یہ ہے کہ پلاٹ کا مجموعی اثر نہ بگڑنے پائے۔ ـــــ"۔ [2]

---

[1] ناول کا فن ای۔ ایم۔ فارسٹر ترجمہ ابوالکلام قاسمی ص ۶۵

[2] ناول کیا ہے ڈاکٹر محمد حسن فاروقی ص ۲۱

عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں قصہ اور پلاٹ کس حد تک ہم آہنگ
ہیں۔ کیا یہ کہانی کرداروں کے ساتھ چلتی ہے یا انہیں اکیلا ہی کہانی کے جال میں بھٹکنے کے لئے
چھوڑ دیتی ہے۔ یہ ناول ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی داستانِ حیات ہے۔ اس ناول کو کچھ نقاد
سوانحی ناول بھی مانتے ہیں

شمشاد یعنی شمن اپنے ماں باپ کی دسویں اولاد تھی گھر میں چونکہ پیسہ تھا اس لئے سبھی
بچے جانوروں کی طرح پل رہے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے جس گھر میں زیادہ بچے ہوتے ہیں
عموماً گھر کی بڑی بہن چھوٹے بچوں کو پالتی ہے۔ مگر شمن کی بڑی بہن جسے سب "آپا" کہتے
تھے اس کی طرف توجہ نہیں دیتی ___ اس گھر میں ماں صرف بچوں کو پیدا کرتی ہے۔ پالتی
نہیں۔ لہذا آگرہ سے ایک انا بلائی جاتی ہے جو شروع میں شمن کی پرورش کرتی ہے
یہ انا سولہ سترہ برس کی جوان لڑکی تھی اس وجہ سے شمن کی خواہشات کو ٹھیک سے نہ سمجھ
پاتی اور شمن غلاظت میں پڑی رہا کرتی اس انا کا ایک عاشق بھی تھا جس کا راز جلد ہی فاش
ہو گیا اور انا کو واپس آگرے بھیج دیا گیا۔ یہ شمن کی زندگی کا دوسرا حادثہ تھا۔ بڑی آپا چونکہ اماں
کی اولادوں کی پرورش کرتے کرتے بور ہو چکی تھیں اس وجہ سے انہوں نے شمن کی پرورش کی طرف
توجہ نہ دی مگر منجھو (جو آپا سے چھوٹی بہن تھی) نے شمن کو پالنے کی ذمہ داری لے لی۔ منجھو بی نے جہاں
شمن کو پیار دیا وہیں اسے بے انتہا مارا بھی۔ صفائی کی اس قدر تاکید کی کہ وہ گندگی کی طرف زیادہ سے زیادہ
مائل ہوتی گئی۔ دھول مٹی میں کھیلنا، مٹی کھانا، گائے بیلوں کے باڑے میں گھومنا اس کی عادت
میں شمار ہو گیا۔ اس کی دوست بھنگن کی لڑکی تھی اس لئے گندگی سے اور بھی لگاؤ پیدا ہو گیا
منجھو چونکہ خود ماں نہ تھی اس لئے وہ اسے پیار تو دے سکتی تھی مگر ماں کی ممتا نہیں جس کی اسے
ضرورت تھی۔ ہر بچے کو ممتا اور پیار کی ضرورت پڑتی ہے مگر شمن اس سے محروم رہی زندگی
گزارتی تھی اور وہ گزار رہی تھی۔ منجھو نے اس سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی اسے ہر بات پر
مار پڑی اور اسی مار نے اسے ٹیڑھا بنانا شروع کر دیا۔ اب وہ بات بات پر ضد کرتی گندگی
میں کھیلتی اور خوب گندی ہوتی مٹی تو وہ ایسے کھایا کرتی جیسے کوئی حاملہ عورت ہو، اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پیٹ میں کیچوے پڑ گئے۔ سب گھر میں اسے "بھتنی" کہتے اور وہ کسی
خونخوار بلی کی طرح جھپٹ پڑتی اور غصہ میں ایسا نوچتی کہ لوگوں کے گوشت میں ناخن گڑ جاتے

اور خون بہنے لگتا وہ ان لوگوں کی وجہ سے منجھو بی کو مارنے لگی۔ تخیل میں ٹھیک اسی طرح گھس گھس کر نہلاتی جس طرح منجھو بی نہلاتی تھی۔ جی نہ بھرتا تو بے جان چیزوں سے بدلہ لینے لگی اپنے غصہ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو کم کرنے کے لئے ایک روز اس نے اپنی گڑیا کو خوب مارا اور ہاتھ پیر الگ الگ کر اس کا برادہ نکال کر اسے چین ملا۔ تبھی اسے معلوم ہوا کہ اس کو اب پڑھنا بھی ہے اس کی بہن نے قاعدہ لیکر پڑھانا شروع کیا۔ شمن یہ "الف" ہے مگر شمن کو یقین نہ آیا۔ اور اسی طرح جب وہ اسے بتاتی ہے کہ یہ "ص ۔ ص" ہے تو اسے بالکل ہی اعتبار نہ ہوا کیونکہ یہ تو چائے دانی کی شکل کا معلوم ہوتا ہے اور اسکے صبر کا پیمانہ تو اس وقت لبریز ہوا جب "ا" سے انار کہنے کو کہا گیا۔ اسے قطعی یقین نہ آیا کیوں کہ ایک تو "الف" لمبا ہے اور "انار" گول اور پھر "الف" سے "انار" کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ تیز اور تخیل بلند ہے بات کو جب تک اچھی طرح سمجھ نہ جائے مانتی نہیں ہے آخر کار شمن نے اس کتاب سے یہ سوچ کر سمجھوتا کر لیا کہ اس کے بعد تو پڑھائی ختم ہو جائیگی۔ مگر اس کو یہ جان کر سخت کوفت ہوتی کہ اس کی پڑھائی تو اب شروع ہوئی ہے آگے بھائی کی طرح موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔

پھر وہ دن آ گیا جب منجھو بی دلہن بنی بیٹھی تھی کوئی شمن کو دیکھنے والا نہ تھا۔ لہذا اس نے اپنے خالی وقت کو نہایت بے تکے کاموں میں صرف کر دیا۔ جیسے بری کی شکر کو غسل خانے کے مٹکوں میں گھول دیا۔ کچن میں جا کر کھانوں میں نمک اور کوئلہ کی راکھ ملا دی اور کھیلتے کھیلتے کھیر میں گر پڑی۔ کسی نے اسے نہلانے کی کوشش کی تو آدھا نہا کر ہی بھاگ آئی اور تولیہ لپیٹ کر تین دن تک گھومتی رہی۔ موقع دیکھ کر وہ جہیز کے کمرے میں گھس گئی اور سب کپڑوں کو نوچ ڈالا۔ تولیہ باندھ کر وہ سبھی بچوں میں ایک انوکھی چیز بن گئی تھی۔ یہاں عصمت نے بچوں کی نفسیات کی بڑی باریک مثال پیش کی ہے۔ وہ یہ کہ سبھی بچے اس تاک میں تھے کہ وہ اسے تولئے سے الگ کر کے کسی طرح ننگا دیکھ لیں۔ یہاں تک شمن کی شرارتیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ جوتا چرائی کی ایک رسم میں شمن کو جوتا چھپانے کے لئے دیا جاتا ہے اور وہ اسے پانی کے مٹکے میں ڈال آتی ہے اسی پانی سے سمدھنوں کو خوب شربت پلایا گیا

منجھو کے سسرال چلے جانے کے بعد وہ لاوارث ہو گئی کئی روز بعد جب گندگی سے بے حال ہو گئی تو اماں کو اسے نہلانے کا خیال آیا۔ وہ رات دن منجھو کو یاد کرتی اسے پکارا کرتی

اور منجھو بی کے شوہر کے مرجانے کی دعائیں مانگا کرتی کہ اسی اثنا میں اسے خبر ملی کہ اس کی بہن
کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی کہ خدا نے اس کی دعا سن لی ہے مگر جلد ہی
اس کی خوشی پر پانی پھر گیا کیونکہ آپا کے شوہر کا انتقال ہوا تھا اور وہ اب مستقل طور سے یہیں
رہنے آرہی تھیں رہی سہی کسر آپا نے آکر پوری کر دی۔ وہ بات بات پر اپنی بیٹی نوری سے مقابلہ
کرتیں اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتیں۔ دوسروں کے سامنے اس کی برائی ہوتی
اس کا مذاق اڑاتیں نوری کو اچھا ثابت کرنے کے لئے شمن کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ شمن اسی
دوران احساس کمتری کی زبردست شکار ہوگئی۔ اور اب حالت یہ تھی کہ وہ کونوں کتردں
میں بھٹکا کرتی رویا کرتی کسی کے سامنے نہ آتی۔ منجھو کے واپس آنے پر اس کو صدمہ یہ پہنچا کہ
وہ اس کی طرح گندی اور اداس نہیں تھی بلکہ عمدہ کپڑوں میں ملبوس تھی آتے ہی سب سے گلے مل
مل کر خوب روئی مگر شمن کو بڑی دیر بعد یاد کیا۔ تبھی بڑی آپا کا حکم بھی مل گیا خبردار جو یوں گندی
سی منجھو کے کمرے میں گئی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ منجھو نے اسی وقت آکر پرانے گھونسے اور تھپڑ
مارے کہ وہ مارے خوشی کے رو پڑی۔ کسی نے تو اسے دیکھا کسی نے تو اس کی طرف بھی
توجہ دی اور اسی خوشی میں وہ دستر خوان پر خوب ضد کر کر کے کھانے کھاتی ہے اس کی
یہ ادا آپا کو ایک آنکھ نہ بھائی وہ اسے چمٹے سے خوب ڈانٹتی ہیں اور ایک بار پھر اس
نے اپنا غصہ بے جان چیزوں پر اتارا اس نے اپنے انتقام کے جذبے کی تسکین کے لئے
آپا کی ہری بھری کیاری کو نوچ ڈالا۔ برباد کر ڈالا اور اس قدر روئی کہ نکسیر پھوٹ نکلی اور وہ
کافی دنوں تک بیمار پڑی رہی۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد اسے منجھو کے ساتھ اس کی سسرال بھیج دیا گیا۔ وہاں منجھو
کی ساس اور اس کا پوتا کدن دونوں کو ہی اس نے ناپسند کیا کدن کو پہلے ہی دن
اتنا مارا کہ وہ شمن کے رعب میں آگیا۔ شمن نے کدن کو بالکل پسند نہ کیا۔ کیونکہ ایک تو وہ
سب کے کام بغیر کچھ کہے سنے کر دیتا اور دوسرے اپنی دادی کے پاس ہمیشہ گھسا رہتا مگر
مجبوری میں شمن نے کدن سے دوستی کر ہی لی لیکن جب کدن کی دادی نے شمن کی
بوئی ہوئی گولی زمین سے نکال کر دھو ڈالی تو اس پر پھر غصے کا دورہ پڑ گیا اور دادی کی
ساری کیاری نوچ کر برباد کر ڈالی۔

ماں کیسے بن سکتی ہے ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور تب اسے خوب ساری نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

بڑی آپا شمن کو جس قدر مارتیں اور ذلیل کرتی تھیں وہ سب کا بدلہ ہاسٹل میں نوری سے لینے لگی۔ آخر پریشان ہو کر آپا نے پرنسپل کو لکھا کہ نوری کو شمن کے کمرے سے الگ کر دیا جائے ایسا ہی ہوا نوری دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور شمن کے کمرے میں رسول فاطمہ نام کی دوسری لڑکی آ گئی جو ہم جنسیت کی شکار تھی۔ رسول فاطمہ سے بچنے کے لئے وہ اپنی دوست سعادت کے کمرے میں چلی جاتی ہے مگر وہاں بھی یہی سب کچھ تھا۔ سعادت نجمہ پر مرا کرتی تھی آخر کار شمن بھی اس بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے ویسے یہ ہاسٹل ایسا تھا جہاں "مرنے والیوں" کی پوری فوج موجود تھی۔

"ٹیڑھی لکیر" کو عصمت نے تین منزلوں میں بانٹا ہے۔ یہاں پر آ کر دوسری منزل شروع ہوتی ہے۔ سعادت اپنی خراب صحت کی وجہ سے پہاڑ پر چلی گئی تھی اس کی سہیلی بلقیس کی بڑی بہن جو انگلینڈ سے واپس آئیں تھیں اسکول کی نئی پرنسپل بن گئیں اور اپنی پانچ بہنوں کے ساتھ اسکول کے احاطے میں رہتی تھیں پرنسپل اپنی سبھی بہنوں کے ساتھ کھلے طور پر لڑکوں سے عشق کیا کرتی بلقیس نے ہی شمن کو ایک نئی اور اہم بات یہ بتائی کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیئے۔ اور اس طرح بلقیس نے ہی شمن کا پہلا پیار اپنے بھائی رشید سے کرا دیا۔ اسکول میں پرنسپل اور ان کی چار بہنوں کے عاشقوں کے چرچے عام ہونے کے ساتھ ساتھ اسکول کی لڑکیاں بھی اب لڑکوں پر عاشق ہونے لگیں۔ اور کوڑیالوں کا ذکر عام ہو گیا راتوں کو بلقیس اپنے عاشقوں کے قصہ سنایا کرتی اس کے عاشقوں کی گنتی کرنا آسان نہ تھا۔ ادھر رشید اور شمن کا عشق پروان چڑھتا رہا بلقیس قاصد کا کام کرتی رہی اسی بیچ نسیمہ اور کو کو نے آ کر نہ صرف رشید کو شمن سے الگ کر دیا بلکہ چند دنوں کے لئے بلقیس بھی شمن سے الگ ہو گئی۔ نسیمہ چونکہ امیر گھرانے کی لڑکی تھی لہذا اس کا اثر خاص طور سے ہاسٹل کی لڑکیوں پر ہوا اور ہاسٹل فیشن کا میدان بن کر رہ گیا۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ پڑھائی کرنے چلا گیا ہے۔ یہ حادثہ کچھ اس طرح گزرا کہ شمن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، ایسا لگا جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔ اس طرح شمن اپنے پہلے عشق میں ناکامیاب

ہوتی ہے۔

بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ "آپا" میں بھی کافی تبدیلیاں آگئیں اب وہ بہت خاموش رہنے لگیں تھیں ان کی دوستی مونچھوں والی عزیزہ بیگم سے ہوئی تھی جن سے سارے گھر کے لڑکے پردہ کرتے ان دونوں میں بھی "ہم جنسیت" کا رشتہ تھا گو عصمت نے اس کا بیان وضاحت سے نہیں کیا ہے مگر اس طرف بلیغ اشارہ ضرور کیا ہے۔ اسی زمانے میں شمن کا خالہ زاد بھائی "اجو" عرف اعجاز ان کے گھر رہنے کے لئے آگیا کیونکہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ اجّو نہایت بے وقوف اور بدصورت تھا اس کو سب چھیڑتے اس کے گنجے سر پر "دھولیں" مارتے اجو چھوٹے سے چھوٹا اور بدترین کام بھی "جھوٹے" کھانے کے بدلے میں کر دیا کرتا تھا۔ وہ گھر کا کام بہت مستعدی سے کرتا اسے بچے ہوئے جھوٹے کھانے سے خاص دلچسپی تھی وہ مرغیوں کے "دانوں" "کتوں کے راتب"، اور برتنوں میں بچے ہوئے کھانے بھی چوری چھپے کھا لیا کرتا تھا۔ بچپن میں اجّو کی شادی شمن سے طے ہو گئی تھی۔ وہ شمن سے نہایت بھدّے انداز میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ رات کو جب سب سو جاتے تو وہ گھنٹوں شمن کے پلنگ کے پاس پانی پینے کے بہانے اس تاک میں کھڑا رہتا کہ شمن کے جسم کو چھو سکے۔ مگر شمن کو اعجاز بالکل پسند نہ تھا آخر کار وہ شمن کی جوتی سے مار کھا کر زبر دست بیمار پڑ جاتا ہے اور پھر پڑھائی کی غرض سے کہیں اور چلا جاتا ہے۔

اجّو کے بعد ناول میں عبّاس کی آمد ہوتی ہے۔ یہ شمن کے چچا کا لڑکا ہے جو انگلینڈ سے انجنیئر بنکر آیا ہے یہ وہی چچا ہیں جن کی آمد پر سب خفا ہوتے ہیں اور ڈیوڑھی میں پلنگ بچھوا دیا جاتا، نوکر کھانا دے آتے اس بار جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تو خوب عزّت ہوئی۔ عباس سے سبھی لوگ اپنی اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ لڑکے کو پھنسانے کے لئے چچا چچی اور ان کی لڑکی کی خوب خاطر داری کرتے۔ گھر کی سبھی جوان لڑکیوں سے عباس دلچسپی رکھتا ہے گا ہے گا ہے لڑکیوں کو پکڑنا اور چھیڑنا تو جیسے اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ گھر والے اسی لالچ میں تھے کہ چچا چچی ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا پسند کریں گے مگر چلتے وقت چچا نے عباس کی شادی کا نیوتا دیکر سب کو نا امّید کر دیا۔ شمن واپس اسکول آتی

خالہ زاد بھائی اجو (اعجاز)

عباس چچا چچی کا بیٹا

ہے تو یہاں اس کی ملاقات رائے صاحب اور ان کی بیٹی پریما اور بیٹے نریندر سے ہوتی ہے۔

پریما۔ شمن کی دوست ہے وہ اپنے والد سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ بھی نہ صرف اسے بیٹی بلکہ اپنی دوست مانتے ہیں رائے صاحب کی شخصیت رعب دار اور متاثر کرنے والی ہے۔ شمن سے بھی وہ بڑے کھلے انداز میں بات کرتے اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں شمن چونکہ والد کی محبت سے محروم رہی تھی اس وجہ سے وہ اس باپ بیٹی کی محبت کو صحیح تناظر میں سمجھ نہیں پاتی اور رائے صاحب سے عشق کا اظہار کر بیٹھتی ہے۔ اور پشیمانی اٹھاتی ہے۔ جلد ہی رائے صاحب کا انتقال ہو گیا اور بات ختم ہو گئی اس بات کا شمن پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ایک تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی اور دوسرے زبردست بیمار پڑی۔ اس بیماری کے دوران اسے اپنے گھر والوں سے اور بھی نفرت ہو جاتی ہے گھر کے متعلق اس کا تجربہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور بھی زیادہ تلخ ہو جاتا ہے۔ بیماری کی وجہ سے وہ نہایت چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھی تبھی اعجاز اس کے گھر میں قدم رکھتا ہے اس بار وہ پرانا والا "اجّو" نہیں تھا بلکہ وہ ایک خوبرو اور پڑھا لکھا جوان تھا۔ جواب دوسرے دن کا بات بات پر مذاق اڑاتا اور شمن کو چھیڑتا۔ ایک بار پھر سارا گھر اپنی اپنی لڑکیوں کے ساتھ اسے پھنسانے کیلئے مستعد نظر آتا ہے۔ مگر اعجاز شمن کی دوست بلقیس سے شادی کا خواہشمند ہے اس کام کے لئے وہ شمن سے سفارش کروانا چاہتا ہے۔ شمن حالانکہ اعجاز کو پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر شاید وہ اسے غیر شعوری طور پر پسند کرتی تھی اسی وجہ سے یہ سن کر اسے بے انتہا افسوس اور صدمہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی دوست بلقیس کو پسند کرتا ہے شمن نے اس سلسلے میں اس کی مدد نہیں کی بعد میں جب اعجاز سے شمن کی شادی کی بات چلی تو شمن نے اس سے شادی سے انکار کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔

شمن کی دوست ایلما جو "باغی" خیالات کی تھی اسے لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں سے دوستی کرنے میں مزہ آتا۔ وہ "عیسائی" ہوتے ہوئے بھی کرشن جی کی پجارن تھی اپنے باغی خیالات کی وجہ سے ہی اسے اسکول سے نکال دئے جانے کی دھمکی دی جا چکی تھی۔ کالج میں آنے کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی اب اسے معلوم ہوا کہ دنیا کتنی بڑی

ہے۔ ایلما سے شمن کی دوستی گہری ہو گئی اور اس کے کھلے خیالات سے شمن نے کافی کچھ سیکھ لیا تھا اب وہ پہلی والی شمن نہ رہی تھی وہ خود اپنے آپ کو پہچاننے میں دقت محسوس کرتی۔ کالج میں داخلہ اس کی زندگی کا اہم موڑ ہے۔ اس کی ملاقات کالج کے پریسیڈنٹ افتخار سے ہوتی ہے اور یونین کے لوگ بھی جیسے ستیل مس بوگا بھی اسے کم متاثر نہیں کرتے بعد میں شمن بھی کالج یونین کی ممبر بن جاتی ہے اور اسی دوران افتخار سے اس کا گہرا تعلق ہو جاتا ہے۔

نوری کی شادی طے ہونے کی خبر ملنے پر شمن اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ نوری کو "مایوں" میں بیٹھا دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔

شادی کے دوران اس نے بڑے بزرگوں کے خیالات کا خوب مذاق اڑایا اسے مہر کی رقم ایسی معلوم ہوئی جیسے کسی نے نوری کی جوانی کا سودا " اکیاون ہزار" میں کر لیا ہو۔ اسی دوران اس نے ایک ایک رسم کو ایک ایک بات کو بڑے غور سے دیکھا اور اس کے بارے میں گہرائی سے سوچا۔ پہلے اسے شادی سودے بازی معلوم ہوئی۔ مگر جب نوری رخصت ہونے لگی تو اس کے خیالات ایکدم بدل گئے معلوم ہوتا تھا یہ شادی سودے بازی نہیں بلکہ محبت کا ایک پاک رشتہ ہے جس کو گھر والوں کے سامنے اقرار کر لیا ہو اور ساری زندگی خوش رکھنے کا وعدہ کر کے دولہا نوری کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہو......

شادی کے بعد نوری کو سوائے اپنے شوہر کی شرارتوں کے بیان کے کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہ رہ گئی تھی۔ ادھر افتخار "دق" کا مرض بڑھ جانے کی وجہ سے بھوالی علاج کے لئے چلا گیا تھا۔ اب افتخار کی جگہ ستیل نے لے لی تھی اور شمن ایک بیدار ذہن عورت کی طرح یونین میں کام کرتی رہی۔ ترقی پسند تو یہ لوگ تھے ہی اب اشتراکی بھی ہو گئے۔ ملک کی آزادی کے لئے کھادی پہننا ضروری سمجھا جاتا تھا لہذا ان لوگوں نے بھی کھادی پہننا شروع کر دیا اسی دوران معلوم ہوتا ہے کہ روشن خیال "ایلما" ستیل کے بچے کی ماں بننے والی ہے لیکن عجیب وغریب ایلما ستیل سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لئے اس کے بچے کا اسقاط کروانے کے لئے کسی دوسرے شہر چلی جاتی ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد شمشاد نے زمانے کی افراتفری دیکھتے ہوئے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول کر لی۔ مگر قومی اسکول کا تو حال ہی برا تھا۔ ایک رئیس نے عمارت خیرات

میں دیدی دوسرے نے اپنی تمام کتابیں جو بالکل بے کار تھیں دیدیں۔ پڑھنے والی لڑکیاں
جن کا نام رجسٹر میں درج تھا شاید وہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ استانیوں کے حال بدتر تھے
انہیں بیس ۲۰ روپے دیکر تیس ۳۰ روپیہ وصولی کے کاغذ پر دستخط لیئے جاتے اور رسید لی جاتی
دو چپراسنیں تھیں۔ جو ایک زمانے میں طوائفوں کی نائیکہ رہ چکی تھیں۔ ایک چپراسی تھا جو منیجر
صاحب کا بیرا۔ باورچی۔ فراش اور بچوں کی گورنس کی خدمات انجام دیتا۔ قومی اسکول کا حال قوم
کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا۔ یہاں نہ پڑھائی ہوتی نہ قاعدے قانون سیکھائے جاتے۔ شمن ابھی
قومی اسکول کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک روز افتخار نے آکر اسے حیرت میں ڈال دیا
معلوم ہوا کہ وہ جیل میں تھا۔

شمن قومی اسکول کی نوکری کے دوران اس قدر پریشان ہوئی کہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر
آرام کے ارادہ سے گھر سے نکل پڑی مگر وہ اپنی منزل نہ طے کر پار ہی تھی۔ اسی دوران اس کو ایلما
اسٹیشن پر مل گئی۔ دو پرانی سہیلیوں نے آپس میں مل کر اپنے دکھ درد کہہ سنائے معلوم ہوا
ایلما نے نہ چاہتے ہوئے سیتل کے بچہ کو جنم دیا ہے اور مجبوراً پال رہی ہے مگر دونوں میں بالکل
نہیں بنتی۔ اور بیٹا بالکل متضاد مزاج کا مالک ہے وہ نفرت جو ایلما کو سیتل سے ہو گئی تھی اس
کا انتقام وہ اپنے بیٹے "رولف" سے لیتی ہے اسے بات بات پر مارتی اس کی باتیں نہ سنتی
اور نفرت کرتی۔ شمن نے کچھ ہی دنوں میں ماں بیٹے کے درمیان کا فاصلہ کم کرایا اور واپس اپنے
اسکول آگئی۔ مگر اسکول کی بوسیدہ فضا سے جلد ہی دل گھبرانے لگا۔ اسی گھبراہٹ اور اکیلے
پن کو دور کرنے کے لئے اس نے کلب جانا شروع کر دیا وہیں اس کی ملاقات منظور
صاحب سے ہوتی ہے۔ یہ ایک رئیس آدمی تھے۔ دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔
انہی کے ساتھ شمن گاؤں سدھارنے کے لئے جانے لگی۔ نام تو ضرور سماج کی خدمت کا
تھا مگر ہوتی یہ پکنک ہی تھی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا کہ ایک روز افتخار کا تار ملا "آن ملو" اور
وہ "بھوالی" چلی گئی۔ اس بیچ وہ افتخار کے علاج کے لئے روپے بھیجتی رہی تھی وہ اس کے لئے
سوئٹر اور حلوہ بنا کر لے گئی گویا شمن اور افتخار میں ایک غیر شعوری عشق پروان چڑھ رہا تھا
واپس آنے پر ایلما نے اسے اپنے پاس کچھ روز کے لئے بلا لیا تبھی معلوم ہوا کہ ایلما کی دماغی
حالت ٹھیک نہیں اور رولف کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس دوران وہ ایلما کو بار بار شادی

کرنے کے لیئے تیار کرتی ہے مگر وہ راضی نہیں ہوتی۔ واپس آنے کے بعد زمانے کی رفتار بھاگتی
ہوئی ریل طرح بڑھتی جارہی تھی کہ یکایک حسین بی نام کی ایک عورت نے آکر اسے آسمان
سے زمین پر پٹک دیا جب اسے معلوم ہوا کہ وہ افتخار کی بیوی ہے اور افتخار کا تعلق صرف
شمن سے ہی نہیں بلکہ کئی لڑکیوں، عورتوں اور طوائفوں سے بھی ہے۔ حسین بی
شمن کا خط دکھا کر اسے بلیک میل بھی کرتی ہے۔ شمن اندر سے ٹوٹ جاتی ہے بکھر جاتی
ہے اور جلد ہی اپنے آپ میں ایک تبدیلی لاتی ہے وہ کسی ایک کی نہ رہ کر سب میں تقسیم
ہو جانا چاہتی ہے یہ سٹہ بازی اس نے پروفیسر رحمان، کامریڈ، انقلابی شاعر سبھی کے
ساتھ شروع کر دی۔ مگر چند برسوں میں اس سے بھی جی بھر گیا تو ایک بار پھر شمن نے اپنی
نسوانیت کی خاطر یہ طے کیا کہ وہ خاندان کے کسی بچہ کو گود لے کر پالے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بچہ
جنے بغیر کوئی عورت ماں نہیں بن سکتی اس طرح شمن نے ہزار چاہا کہ کسی بچی کو گود لے لے
مگر ناکام آخر کار اس نے منجھو بی کی ایک لڑکی کو گود لیا لیکن وہ انتقال کر گئی۔ شمن ایسی
شرمندہ ہوئی کہ دوبارہ اس نے کسی بچے کی طرف نہ دیکھا۔ کیونکہ اب اسے معلوم ہو گیا تھا
کہ محبت اور ممتا خریدی نہیں جاسکتی۔

اور ایک بار پھر وہ اپنے اکیلے وجود کو لیکر ایلما سے ملتی ہے اور وہیں پر اسکی ملاقات
روفی ٹیلر سے ہوتی ہے جو انگریز فوج میں افسر تھا۔ یہ انگریز نہیں بلکہ "آئرش" تھا۔ شمن
کو گوری چمڑی سے بہت نفرت تھی مگر محبت کے آگے اسے جھکنا پڑا اور جلدی ہی دونوں نے
شادی کر لی۔ مگر نفرت کا جذبہ جلد ہی پھوٹ نکلتا ہے۔ پہلے ہلکی پھلکی لڑائیاں پھر گالی گلوچ
اور پھر لمبی چوڑی لڑائیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور چند مہینوں میں لڑائی سے تنگ آکر روفی ٹیلر
محاذ پر چلا جاتا ہے اور شمن پھر اکیلی تنہا رہ جاتی ہے۔ مگر تبھی ڈاکٹر اسے یہ بتاتا ہے کہ وہ ماں
بننے والی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی یہ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

یہ تھا "ٹیڑھی لکیر" کا سیدھا سا قصہ جو عصمت نے اپنے ناول میں بڑی خوبی سے
دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، ناول کی بنیاد اس کے قصہ پن پر قائم رہتی ہے لیکن
اس کا آغاز اور اختتام کسی خاص اصول یا ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔ عصمت نے اپنے
ناول میں قصے کو فلیش بیک یا شعور کی رو کی تکنیک سے بچا کر بظاہر سیدھے
سادے انداز میں پیش کیا ہے یعنی ناول شمن کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوتا ہے

پھر بچپن اور نوجوانی کی منزلوں سے گزر کر اس کی شادی اور شادی کے واقعات کو سمیٹتا ہوا ایک نازک اور اہم موڑ پر ختم ہو جاتا ہے ناول میں شمن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور ایک بہترین اور کامیاب فلم کار کی طرح عصمت چغتائی نے شمن کے قصے میں تمام واقعات کو باہم مربوط کرنے والی ڈوری کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اُسے کہیں بھی الجھنے کٹنے یا ٹوٹنے نہیں دیا۔ غالباً اس لئے ڈاکٹر ہارون ایوب نے "ٹیڑھی لکیر" کے پلاٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُسے روایتی قرار دیا ہے جو صحیح ہے اپنی کتاب "اردو ناول پریم چند کے بعد" میں لکھتے ہیں۔

"ـــــ ناول کا پلاٹ کسی حد تک روایتی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہیرو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے کہانی کی ہیروئن شمن کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے سہارے ترتیب دی گئی ہے۔ جہاں اس کی زندگی میں کئی لڑکے ہی نہیں آئے بلکہ ایک ضعیف العمر رائے صاحب بھی شمن کی زندگی میں آتے ہیں اگرچہ ان کا جلد ہارٹ فیل ہو جاتا ہے مگر وہ شمن میں احساس کمتری پیدا کر چکے ہوتے ہیں، دراصل شمن بچپن ہی سے محرومی کا شکار رہی ہے ......ناول کا پلاٹ بہت سلجھا ہوا ہے اور اپنے اندر بہت معنویت رکھتا ہے عصمت چغتائی نے شمن کے بچپن کے حالات پر بہت زور دیا ہے۔ اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بچہ سب کچھ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے ـــــ"[1]

کسی بھی کامیاب ناول میں تجسس کی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں شروع سے آخر تک ہمیں تجسس برقرار نظر آتا ہے کہ اچھا اب کیا ہوگا شمن کی پیدائش سے لے کر ماں بننے تک میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں اس کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کر دیتی ہے۔ شمن کی عجیب وغریب حرکتیں۔ ایلما کی بے چینی۔ مس بوگا کا کردار۔ افتخار سے شمن کا رشتہ۔ بلقیس کی عجیب وغریب حرکتیں اور اعجاز کی دوبارہ آمد۔ عباس کا کردار چچا کی خاموشی۔ رونی ٹیلر سے محبت اور آخر میں ٹیلر کا لڑائی پر چلے جانا جگہ جگہ پر اب کیا ہوگا؟ یہ سوال دماغ میں کلبلاتا رہتا ہے، اور ہم اس کا انجام جاننے کیلئے بے چین ہوتے رہتے ہیں۔ یہی ایک اچھے پلاٹ کی کامیابی ہے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

---

[1] اردو ناول پریم چند کے بعد ہارون ایوب ص ۱۵۲

"قصہ میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہے اور جتنی زیادہ انتظار کی خلش ہوگی اتنا ہی دلچسپ قصہ ہوگا۔ دنیا کی سب سے اعلیٰ قصہ گو "الف لیلہ" کی شہزادی شہزاد "گزری ہے ____ " [1]

ٹیڑھی لکیر کی مصنفہ واقعہ نگاری کا اچھا سلیقہ رکھتی ہیں۔ اس فن پر ان کی گرفت خاصی مضبوط نظر آتی ہے۔ واقعات کے تال میل کے معاملے میں بھی وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں کیوں کہ ٹیڑھی لکیر میں بیان کردہ واقعات باہم مربوط دکھائی دیتے ہیں اور قدم بہ قدم قصے کو آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل یہ خوبی پلاٹ کی بہترین تنظیم کے بغیر ممکن نہیں عصمت چغتائی قابل رشک تخلیقی ذہن رکھنے والی باشعور ناول نگار ہیں ٹیڑھی لکیر کی پلاٹ سازی میں انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب کام لیا ہے جس کے نتیجے میں ٹیڑھی لکیر کا پلاٹ بے حد گٹھا ہوا اور جاندار دکھائی دیتا ہے اس میں کہیں بھی بے ربطی نہیں ملتی۔ ناول کے کرداروں اور ان کے طریق زندگی میں نفسیاتی الجھنیں ضرور نظر آتی ہیں لیکن پلاٹ یقیناً کسی بھی قسم کی الجھنوں کا شکار نہیں ہوتا عصمت کے تخلیقی ذہن نے ناول کے پلاٹ کو جو شکل عطا کی ہے اس میں بڑی قطعیت اور فن کاری ملتی ہے ٹیڑھی لکیر کے پلاٹ کو ہر طور گٹھے ہوئے پلاٹ کے زمرے ہی میں شمار کیا جائے گا۔

ٹیڑھی لکیر کے اختتام پر کچھ نقادوں نے اعتراض کیا ہے لیکن ہمارے تئیں اس ناول کا اختتام نہایت عمدہ ہے کیونکہ قاری میں ایک طرح کی بے چینی چھوڑ کر کہ شمن نے بچہ پیدا کیا ہوگا یا نہیں؟ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

اسلم آزاد اس ناول کے پلاٹ کو تہہ دار اور معنی خیز بتاتے ہیں وہ لکھتے ہیں

"ضدی ہیں پلاٹ کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ہے مگر "ٹیڑھی لکیر" اور "معصومہ" کے پلاٹ میں جامعیت ہے۔ بالخصوص "ٹیڑھی لکیر کا پلاٹ سیدھا سادہ اور اکہرا نہ ہونے کی وجہ سے وہ دقیع ہوگیا ہے۔ اس کے پلاٹ میں تہہ داری اور بڑی معنی خیزی ہے ____ " [2]

---

[1] ناول کیا ہے — احسن فاروقی — ص ۱۸

[2] اردو ناول آزادی کے بعد — اسلم آزاد — ص ۲۴۷

بہ لحاظِ مجموعی عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر خود ان کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا ایک شاہ کار ناول ہے اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

قصے کا ربط و ضبط اور پلاٹ کی فن کارانہ تنظیم اس ناول کی ایسی خوبیاں ہیں جنہیں ادب کا کوئی نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دراصل ان خوبیوں نے ہی اسے ایک شاہ کار بننے میں مدد دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشن پرشاد کول جیسے بزرگ نقاد نے بھی (جو نئے ادب کے بڑے نکتہ چیں سمجھے جاتے ہیں) اپنی کتاب "نیا ادب" میں ٹیڑھی لکیر کا ذکر پریم چند کے ناول "گئو دان" کے ساتھ کرتے ہوئے اسے عصمت چغتائی کا شاہ کار قرار دیا ہے۔

ٹیڑھی لکیر میں کردار نگاری

کردار نگاری ناول کا اہم ترین عنصر ہے۔ نذیر احمد کے ناول سے لے کر عبداللہ حسین کے ناول "باگھ" تک اردو کے تمام اہم ترین ناولوں میں کردار نگاری پر خاصا زور ملتا ہے "فسانۂ آزاد" کے میاں آزاد اور خوجی "توبۃ النصوح" کے مرزا ظاہر دار بیگ اور کلیم "امراؤ جان ادا" کی مرکزی کردار امراؤ جان، خانم، بسم اللہ اور گوہر مرزا "گئودان" کے ہوری، دھنیا اور گوبر "آگ کا دریا" کے گوتم نیلمبر، چمپا اور کمال "اداس نسلیں" کے نعیم "لہو کے پھول" کے راحت رسول وغیرہ اردو ناول کے چند ایسے اہم کردار ہیں جنہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

جدید ناول نگاری کا فن کردار نگاری کے پرانے فارمولے کا قائل نہیں۔ اردو ناول میں اسی طرح کے اہم کردار کو ناول کی جان کہا جاتا ہے اور اس کی پیش کش کے معاملے میں ناول نگار خصوصی توجہ صرف کرتا ہے تاکہ ان کرداروں کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کے تجربات اور خود اپنی ذات کا اظہار کر سکے۔ ای۔ ایم فاسٹر نے کرداروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

"ہم کرداروں کو سپاٹ FLATE اور تہہ دار ROUND میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ سپاٹ کرداروں کو سترہویں صدی میں مزاحیہ کہا جاتا تھا اور اب انہیں مثالی کردار یا کردار کی بگڑی ہوئی شکل کہا جاتا ہے۔ اس کی اصلی شکل کی تعمیر کسی واحد

خیال یا وصف کے گرد ہوتی ہے۔ اگر ایسے کردار میں ایک سے
زیادہ پہلو نکلنے لگیں تو وہ تہدار کی تعریف کی طرف رخ کرنے لگتے ہیں۔"[۱]
"کسی تہہ دار کردار کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ موثر انداز سے
متحیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں؛ اگر وہ کبھی حیرت
و استعجاب کا باعث نہیں بنتا تو وہ سپاٹ کردار ہے اگر وہ
قائل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے تو وہ تہہ دار ہونے کا ڈھونگ
رچانے والا سپاٹ کردار ہے۔ وہ اپنے گرد بکھری ہوئی زندگی
یعنی کتاب کے اوراق میں بند زندگی کو شمار کرنے کی صلاحیت
سے عاری ہے۔"[۲]

یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ کردار دو طرح کے ہوتے ہیں اور ساری کہانی کے قصے انہی کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کردار اپنے معاشرے کی اپنے طبقے کی اپنے رہن سہن بات چیت، لب و لہجہ کی اور ساتھ ہی رسم و رواج کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اور تبھی ایک کردار اچھا کیسے بن جاتا ہے اس بارے میں سہیل بخاری کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔

"کردار نگاری کی شرط یہ ہے کہ قاری ناول کے کرداروں سے کوئی
اجنبیت محسوس نہ کر پائے۔ وہ ہم جیسے گوشت پوست کے چلتے پھرتے
انسانوں کے نمونے ہوں اور ان میں ہماری ہی طرح خوبیاں اور خامیاں
ہوں۔ . . . . . . ناول نگار کرداروں کو اپنی تخیلیت کی مدد
سے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جو صفت اور خصوصیت
ہم میں معمولی حد تک پائی جاتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم ملتی ہے اس کے
علاوہ جتنی خصوصیات بہت سے آدمیوں میں فرداً فرداً نظر آتی ہیں

خوب

۱۔ ناول کا فن　　ابو الکلام قاسمی　　ص ۴۴
۲۔ 〃　　〃　　۵۴

وہ سب کی سب ایک ہی کردار میں مجتمع ہو جاتی ہے۔ ایک کردار سے مختلف انسانوں کو جو ہمدردی ہو جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان سے ہر ایک اپنی اپنی ذات کا کچھ نہ کچھ حصہ اس میں پالیتا ہے۔" [1]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اچھے کردار میں چند خصوصیات ہونی ضروری ہیں یعنی وہ کہانی کے حادثات سے متاثر ہو اور انسانی کمزوریاں و خوبیاں دونوں موجود ہوں اور قاری ناول پڑھتے وقت اس کردار کو اس حد تک پہچاننے جاننے لگے جتنا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کو بھی نہیں جانتا۔ "ٹیڑھی لکیر" میں قاری کے سامنے یکے بعد دیگرے بہت سے کردار آتے ہیں۔ ان میں سے چند اس کے ذہن پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑتے ہیں اور چند خود بخود اس کے ذہن کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" کو بیشتر ناقدین نے کرداری ناول تسلیم کیا ہے۔ اس کے کرداروں میں شمن، بڑی آپا، منجھو بی، رلے صاحب، افتخار، رونی ٹیلر، ایلما، رسول فاطمہ، نجمہ، نوری، اجو اور کدن وغیرہ ایسے کردار ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے قاری کو متاثر کرتے ہیں اور ناول میں بھی اپنا اہم رول ادا کرتے ہیں عصمت چغتائی کا شاہکار ٹیڑھی لکیر ایک کرداری ناول ہے جیسا کہ امراؤ جان ادا یا پھر پریم چند کا نرملا ہے۔ مگر یہ ناول مذکورہ دونوں ناولوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ کیوں کہ اس کی ہیروئن شمن کے پیدا ہونے سے لے کر اس کی شادی ہو جانے کے بعد تک کی کہانی ہے۔ اس کردار کو قاری ایسا جانتا ہے جیسے کوئی اپنے بچے کو وہ اس کی ایک ایک عادت، حرکت، خیالات، ضد، غصہ اور حد تو یہ ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور پسند ناپسند کو بھی جانتا ہے۔

شمن سب سے پہلے ایک ضدی لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کے اندر ضد کا زبردست مادہ ہے۔ اور اسی ضد کی وجہ سے نہایت غصہ ور اور جذباتی ہو جاتی ہے اسے کسی کی ناانصافی پسند نہیں آتی۔ اس لئے وہ ان سے بدلا لینا چاہتی ہے اسے ہر غلط بات پر غصہ آتا ہے۔ منجھو بی سے مار کھانے کے بعد آپا سے ذلیل ہونے یا پھر کیاری سے دھنیا توڑ لینے کے بعد وہ ہمیشہ غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ خوب مارتی ہے تو چیختی کھسوٹتی ہے اس کی ضد اور غصہ دونوں اس کے دماغ پر جنون کی طرح طاری ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ وہ بہت

---

[1] اردو ناول نگاری۔ سہیل بخاری۔ ص ۲۷/۲۶

چھوٹی ہے۔ اس وجہ سے کسی انسان پر اس کا رعب نہیں پڑتا۔ وہ کسی کو مار نہیں پاتی اس لئے اکثر اپنی گڑیا، کیاری اور بستر کو ہی نوچ کھسوٹ کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی ہے۔

"دھڑ دھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھار کر دی۔ دانتوں اور ناخونوں سے اس کے پرزے کر دیئے۔ گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو" [1]

"وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پاجامے، سڑی ہوئی بنیائیں اور پسانڈے کرتے وہ غصے میں ان سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔" [2]

شمن میں انتقام کا زبردست مادہ ہے کسی شخص نے اگر اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو وہ اسے بخشتی نہیں۔ چاہے وہ شخص اس سے عمر میں کتنا ہی بڑا یا چھوٹا کیوں نہ ہو۔ اس نے کسی کو معاف کرنا نہیں سیکھا۔ یا یوں کہئے معاف کرنا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ بڑی آپا نے اپنی بیٹی نوری سے اس کا مقابلہ کر کے اسے اکثر ذلیل کیا۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ اور ان کی کیاریاں برباد کر کے بدلا لیتی ہے کدن کی دادی سے بھی بدلا لیتی ہے۔ اسی طرح "کدن" کو بار بار مار کر بھی انتخار نے اس کے ساتھ ناانصافی کی تو اس نے اس کی ناانصافی کا بدلا کامریڈ صمد، انقلابی شاعر کو محبت کے نام پر تڑپا تڑپا کر لیا۔ منجھو بی نے اسے پالا پوسا، بڑا کیا، مگر اسے خوب مارا بھی۔ وقت بے وقت کی مار کا بدلا وہ تخیل میں منجھو بی سے لیا کرتی۔ غرض کہ اس نے معاف کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

"بڑی آپا کی کیاریاں! آناً فاناً میں وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔" [3]

---

[1]	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۱
[2]	،،	،،	،،	۳۴
[3]	،،	،،	،،	۳۷

"پھر تخیل میں ہی منجھو بی کو پیٹنے لگی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی"۔ [1]

اعجاز شمن کے بچپن کا منگیتر جب ایک خوش وضع نوجوان بن کر واپس لوٹا تو بجائے خوش ہونے کے وہ اور بھی کڑھ جاتی ہے اور انتہا تو تب ہوتی ہے جب وہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے بیگانہ تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا۔ شاید یہ عمر کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا

"کیا اسے اجو سے محبت ہو چکی تھی!۔" [2]

مگر اس کے باوجود انتقام کی آگ نے اس کے اندر اجو سے پرانی دشمنی اور نفرت بھڑکا دی۔ آخر میں پورا گھر اجو کو اپنا داماد بنانے کا خواہش مند تھا۔ شمن نے اجو سے شادی کرنے سے انکار کر کے نہ صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا بلکہ اجو کو ذلیل بھی کیا۔ کہ دیکھو تم چاہے جتنے بھی اچھے اور دولت مند عزت دار بن جاؤ میری نظر میں وہی حقیر اور ذلیل رہو گے جیسے پہلے تھے۔ اس نے صاف صاف اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ "اعجاز کے علاوہ کسی بھی جانور سے شادی کر سکتی ہے" اور اس طرح وہ اعجاز کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مار کر بدلہ لیتی ہے۔

شمن ایک ذہین لڑکی ہے۔ وہ ہر بات کو نئے انداز سے سوچتی ہے اور غور کرتی ہے۔ وہ کسی بات کو صرف اس لئے ماننے کو تیار نہیں کہ وہ بات کسی بڑے نے کہی ہے بلکہ وہ "کیوں" کا سوال بار بار دہراتی ہے۔ حالانکہ اس "کیوں" پر اسے کئی بار لوگوں کی جھڑکی اور ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ مگر اس کے باوجود اپنے آپ کو بدل نہ پائی۔ وہ ہر بات کو نئے پیرائے سے سوچتی اور غور و فکر کرتی۔ جب اس کی بہن اس کو پڑھانے بیٹھتی ہے تو شمن بے ساختہ پوچھ بیٹھتی ہے کہ "ا" (الف) سے انار کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ الف تو لمبا ہوتا ہے اور انار گول [2] اسی طرح منجھو بی کی جب برات آئی اور سبھی لوگ دولہا

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۰

[2] " " " ۲۲۰

دیکھنے جانے لگے تو دشمن بھی جانے کی ضد کرتی ہے۔ جب کسی عورت نے اسے گود میں لے کر دولہا دکھایا تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ آدمی دولہا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے سوال کیا مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ تبھی اس کا تیز دماغ یہ سوچنے لگتا ہے کہ لڑکے مہندی تو لگاتے نہیں۔ پھر منجھو کے دولہا نے کیوں لگائی۔ اسی طرح جب اس کے ماسٹر صاحب پڑھاتے وقت اس سے کہتے:

"ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟"

اول تو سرے سے یہ گلچھرے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھگاڑی نارنگیاں خریدے گا سڑ نہیں جائیں گی ساری ساری"۔[1]

حالانکہ بچپن کے یہ معصوم سوالات ماسٹر اور گھر والوں کی نظر میں حقیر تھے اور اسے اکثر "کھوڑدہ مغز" کا خطاب دیا جاتا۔ مگر ہر بات کو نئے پیرائے میں سوچنا کسی بات کو گہرائی سے خیال کرنا اور ہر بات کو سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھنا اور سوچنا اس کی شخصیت کی ایک خوبی بن گئی تھی۔ وہ اس دنیا کے بارے میں، عورت کے بارے میں، مرد عورت کے تعلق شادی بیاہ، مذہب سبھی باتوں کو ایک نئے انداز سے سوچتی ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کی بڑی صلاحیت ہے جو عام انسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ اپنی بھانجی نوری کی شادی میں جب وہ گھر جاتی ہے اور نوری کو مایوں بیٹھا دیکھ وہ عورت اور شادی کے متعلق ایک نئے انداز سے سوچنے لگتی ہے اسے عورت بالکل چاٹ کی طرح لگ رہی تھی جس کو اچھا بنانے کے لئے طرح طرح کے خوشبودار مصالحے ڈالے جاتے ہیں اور خریدار کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے وہ سوچتی ہے دلہن کی یہ سب تیاری کیوں؟ یہ ابٹن یہ مہندی کس لئے۔ کس کے لئے یہ سب تیاری ہوتی ہے۔

"عورت! کیا یہی تھی جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح بنا کر کل ایک

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۵۵

"نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سے مصالحے چھڑک دیتا ہے بالکل اسی طرح ذہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے۔" ؎۱

مسلم عورتوں کے لئے اسلام میں پردے کا رواج ہے مگر عورتیں اس پردے کو عذاب سمجھنے لگی ہیں۔ وہ نقاب تو دور چادر اوڑھنے کی بھی خواہش مند نہیں۔ شمن اکثر سوچتی ہے کہ کیا پردہ ہٹا کر عورت نے اپنے پیر پر کلہاڑی تو نہیں ماری۔ کیا عورت پردہ ہٹا کر آزاد ہے؟ اور وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ عورت نے پردہ چھوڑ کر نقصان ہی اٹھایا ہے۔

"سچ تو ہے کتنے مزے سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بد صورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہونگی۔ جسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔" ؎۲

شمن عورت اور مرد کے مسئلے کے بارے میں بہت کھلے خیالات رکھتی ہے۔ عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ مرد ظالم ہوتے ہیں اور عورتیں مظلوم شادی میں سجی بنی زیورات سے لدی بھاری کپڑوں میں عورتوں کو دیکھ کر شمن کو عورت ظالم اور بیچارے مرد مظلوم نظر آنے لگے عورتیں کیا واقعی مظلوم ہیں؟ جو آرام سے اپنے اپنے شوہروں کی محنت کی کمائی کو زیور اور کپڑوں میں برباد کرتی ہیں عورت کو لوگ سیدھی سادی مظلوم گائے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ شمن بڑے فلسفیانہ انداز سے مرد عورت یعنی گائے بیل کے بارے میں سوچتی ہے گویا اس نے ایک نئی تخلیق کی ہے۔

"کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بیچارا زندگی میں زیادہ اُلو بنتا

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۳۹

۲ " " ص ۲۵۰

"یہ کولہو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے
ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے
لیکن یہ گائے! سوائے گھاس چبانے اور دودھ دینے کے
اور کیا کام کرتی ہے؟ ان کی بلا سے دودھ بھرے نہ پیا آدمی نے
کھیر بنا کر کھالی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان
گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں،، لے

بچپن میں شمن کو سبھی کوڑھ مغز" کہا کرتے تھے۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ اسے مذہب، تاریخ، فلسفہ اور ادب سے خاصا لگاؤ رہا۔ جب بھی اسے موقع ملتا وہ رامائن اور اعلیٰ مفکرین کی دیگر کتابوں میں غرق رہتی۔ اسے بات کرکے وقت کاٹنے سے بہتر ادب کا مطالعہ لگتا تھا۔ اسکول میں چھٹی کے دن وہ انہی کتابوں کو پڑھ کر گزارا کرتی۔

"خاموش کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی۔" ٢ے

اور

"چند ہی دنوں میں اس نے ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے "جین ایرا" نے اسے حد سے زیادہ متاثر کیا ....
ٹیگور کی کہانیاں خصوصاً "کاسٹ آوے" پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے۔ ہارڈی کی مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو نچا کر پست کر ڈالا وہ بائرن شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی۔" ٣ے

شمن ایک خود دار لڑکی بھی ہے وہ اپنے ساتھ ہونیوالی ناانصافیوں اور بے ایمانیوں کا

لے ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۵۳
٢ے ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۹۲
٣ے ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۹۲-۱۹۳

ذکر کسی سے نہیں کرتی۔ وہ سب کچھ برداشت کر جاتی ہے۔ بچپن میں اسے گھر میں والدین کا پیار نہ ملا۔ مگر کبھی بھی کسی سے اس نے اس کا ذکر تک نہ کیا۔ رشید نے محبت کے نام پر اس کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ افتخار نے ایک لمبے عرصہ تک نہ صرف شمن کے بھولپن کا فائدہ اٹھایا۔ اس سے مالی مدد بھی لی اسے "اموشنل بلیک میل" بھی کیا۔ اس کے بعد افتخار کی بیوی نے اسے "بلیک میل" کیا اور اس کے سونے کے بندے اور کڑے اتروا کر لے گئی۔ اعجاز (شمن کے بچپن کا منگیتر) نے شمن کی دوست بلقیس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اس کو بیچ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر یہ سب سہنے کے بعد بھی شمن کی خودداری ہی تھی کہ اس نے زبان سے کبھی کسی کی شکایت نہ کی۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی عزیز دوست ایلما سے بھی کسی بات کا ذکر تک نہ کیا کبھی کسی سے شکوہ شکایت نہ کیا۔ یہ اس کی خودداری ہی تھی کہ سب ظلم وستم وہ خاموشی سے آخر تک سہتی رہی۔

شمن کے اندر جہاں خودداری کا جذبہ تھا وہیں بے وفائی کا بھی۔ اپنے چاہنے والوں سے بچھڑ کر روتی نہیں بیمار نہیں پڑتی۔ تڑپتی نہیں بلکہ صبر کر لیتی ہے۔ منجھو سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ مگر منجھو بی کی شادی کے بعد وہ ایک دم بدل جاتی ہیں۔ ان کی بے رخی سے اکتا کر شمن نے انہیں بھولنے کی کوشش کی اور بھول بھی گئی "مس چرن" سے اسے اپنے اسکول میں پڑھائی کے دوران کافی لگاؤ ہو گیا تھا۔ مگر اسکول سے جانے کے بعد وہ انہیں بھی بھول بیٹھی۔ رشید (بلقیس کا بھائی) شمن کو پڑھاتا تھا۔ اس سے وہ محبت بھی کرنے لگی تھی۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ پڑھائی کی غرض سے چلا گیا ہے تو شمن نے دل کڑا کر کے بھولنے کی کوشش کی۔

"شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں یکلخت روشن ہو گئیں۔" ؎

اور

"منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۴۵

کے لئے دفن کرآئی مگر تعجب ہے اسے ذرا بھی افسوس نہ تھا۔"[1]

اس معاملے میں وہ زندگی سے بہت قریب ہے اور بڑی (پریکٹیکل) عملی لڑکی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ رونا دھونا بزدلوں کی نشانی ہے اور وہ بزدل نہیں۔

شمن اپنے سے کمزور لوگوں کو رعب میں دکھنا چاہتی ہے۔ دوسروں پر حاوی ہونے میں اسے خوشی ملتی ہے۔ اس کے اندر لیڈر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی لئے وہ وقت وقت پر اپنی اس صلاحیت کا استعمال کرتی ہے۔ کدّن کی دبو شخصیت پر جلدی ہی اس نے اپنا رعب جما لیا تھا۔ نوری کو بھی وہ چوری چھپے مارا کرتی تھی۔ ہاسٹل میں نسیمہ کے آنے کے بعد اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ نسیمہ اس کی مدمقابل ہے اور اس نے جلدی ہی لڑکیوں کو رعب میں لینا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کام کے لئے اسے کافی محنت بھی کرنی پڑی تھی۔ اس نے نسیمہ کی طرح انگریزی میں بات کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے مزاج کو کافی نرم کر دیا تھا۔ آگے چل کر اپنے کالج کی یونین میں داخل ہوگئی۔

شمن کو اپنے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ وہ نماز روزے یا ندرو نیاز نہیں کرتی۔ اسے اپنے مذہب پر یقین بھی نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ مذہب کو تبدیل کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اسے دوسروں کے مذہب سے بہت جلدی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی اور مذہب کے لوگوں کے بیچ رہ کر وہ ان لوگوں سے متاثر ہو جاتی ہے۔ کئی بار وہ عیسائی ہونے کا خیال کرتی ہے اور جب وہ اپنی دوست پریما کے ساتھ رہتی ہے تو ہندو مذہب کی طرف راغب ہو جاتی ہے اور جب وہ رائے صاحب سے متاثر ہوتی ہے تو ان سے نہ صرف شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے بلکہ اپنا مذہب بدلنے میں بھی اسے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

"کئی دفعہ اس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چپکے سے "یسوع مسیح" کی بھیڑ بن جائے۔"[2]

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۴۹

[2] " " ص ۷۵

"پریما کے ساتھ رہ کر اسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔" ۱؎

"رائے صاحب ..... میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی۔" ۲؎

شمن ہر پل ایک نیا چولا پہن کر سامنے آتی ہے اور اس ناول میں ہر آنے والا کردار شمن کے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہی ایک تہہ دار یعنی ROUND کردار کی نشانی بھی ہے۔

کیوں کہ ایک ساتھ اس کا کردار ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ دار بنکر سامنے آتا ہے۔ شمن کے کردار میں محبت کا جذبہ بھی بہت ہے۔ چونکہ بچپن سے وہ محبت سے محروم رہی ہے۔ اس لئے وہ بار بار دھوکا کھاتی ہے۔ اور ناکامیاب ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں کئی لڑکے آئے ہیں۔ وہ ہلکا پھلکا رومانس بھی کرتی ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوتی۔ حالانکہ رشید سے وہ متاثر تو ہوتی ہے مگر بہت جلدی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اعجاز کو اس نے بچپن سے ہی ناپسند کیا تھا۔ پر اس کی زندگی میں کامریڈ صمد۔ پروفیسر اور انقلابی شاعر کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ اور پھر اس کی زندگی میں اس کی دوست کے والد رائے صاحب آتے ہیں۔ حالانکہ وہ عمر میں بہت بڑے تھے مگر ان کی شخصیت ان کی خوبی ان کی قابلیت ان کی باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کی محبت کو وہ غلط سمجھتی ہے۔ اور اپنے عشق کا اظہار کر بیٹھتی ہے۔ رائے صاحب کا کردار عصمت کے بلند تخیل، گہرے تجربات اور وسیع مطالعہ کی دین ہے۔

۱؎ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۱۸۹

۲؎ " " " ۲۰۱

رائے صاحب سے شمن کی ملاقات اس ناول میں ہی نہیں بلکہ شمن کے کردار کے ارتقار کے لئے بھی ضروری ہے۔ یہاں فرائڈ کے فلسفہ "الکسٹرا کامپلیکس" کی ایک مریضانہ مثال بھی ملتی ہے اور ایک معصوم لڑکی کی معصوم بھول بھی جس نے کبھی کسی بزرگ سے محبت کے چند کلمات بھی نہ سنے تھے۔ شمن کا یہ عشق اس کے مریضانہ اور کچے ذہن کی دین ہے اول تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ باپ بھی بیٹی کو چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خود اس محبت اور شفقت سے محروم تھی۔ اس لئے رائے صاحب کی شفقتوں کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی اور رائے صاحب سے محبت کا اظہار کر کے ایسا شرمندہ ہوئی کہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں افتخار نام کا ایک لڑکا قدم رکھتا ہے۔ چونکہ شمن کھلے دل و دماغ اور "فری نیچر" کی لڑکی تھی اور زندہ دلی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اور ایسا ایک شخص افتخار اسے ملتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہو جاتی ہے اور اس حد تک متاثر ہوتی ہے کہ نہ صرف مالی امداد کرتی ہے بلکہ اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا کر دو جسم ایک جان بھی بن جانا چاہتی ہے۔ اس نے افتخار سے محبت کی اور دل و جان سے کی۔ مگر کامیابی یہاں بھی نصیب نہ ہوئی۔ بقول عزیز احمد

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی نے پیار کرنے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔" ؎

عزیز احمد کا یہ قول معقول نہیں لگتا کیوں کہ شمن نے افتخار سے جی جان اور روح سے محبت کی۔ اس کی بیماری میں مدد کی۔ دوا دارو، روپیوں پیسوں سبھی کچھ تو اس نے کیا۔ مگر جب مرد ہی بے وفا نکل جائے تو عورت کب تک محبت کر سکتی ہے۔ افتخار کی بیوی حسین بی کی آمد نے شمن کی آنکھ کھول دی۔ وہ اس محبت میں ناکامیاب ہو کر روتی نہیں۔ اندر سے ٹوٹی نہیں بلکہ اس نے تلخ تجربے کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔

افتخار کے بعد اس کی زندگی کا سب سے اہم مرد اس کا شوہر ردنی ٹیلرا آتا ہے جس نے شروع میں شمن کو خوب چاہا۔ مگر سمجھ نہ سکا۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے

؎ نئے ادب کے معمار منٹو ص۔ ۲۵

ہوئے پھر وہی جھگڑے بڑی بڑی لڑائیوں میں بدل گئے اور ایک روز شمن پھر اکیلی رہ گئی۔ اس کے اندر محبت کا جذبہ تو بہت تھا مگر وہ اسے کسی کو نہیں دے پائی اور نہ ہی کسی نے اس کو پیار دیا۔ وہ محبت کی بھوکی تھی۔ اور آخر تک وہ اس کی متلاشی رہی یہ اس کی ٹریجڈی بھی ہے۔

شمن کو چھچھورے عشق سے سخت نفرت ہے۔ محبت کے نام پر رونا بلکنا فریادیں کرنا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنا اسے پسند نہیں۔ اس نے رشید کی محبت کو بھی محبت نہ سمجھا۔ ریما کے بھائی نریندر کو وہ منہ نہ لگاتی۔ اور اس کی بھونڈی محبت کا مذاق اڑاتی ہے۔ اعجاز کی چھچھوری محبت کو وہ آخر تک بھول نہیں پائی۔ کامریڈ مہمد پروفیسر، انقلابی شاعر اور انجنیئر ان سبھی کو اس نے محبت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وقت گزارنے کا ایک اچھا ذریعہ سمجھا۔ عباس کی حرکتوں کو اس نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے دماغ میں محبت کا جو تصور تھا وہ اسے زندگی بھر نہ ملا۔

نوکری کر لینے کے بعد شمن بہت بدل جاتی ہے۔ وہ اپنی نوکری کو ذمہ داری سے نبھاتی ہے۔ شمن ایک ذمہ دار استانی، مضبوط ارادہ، بلند خیالی اور اونچے نظریے کی معلمہ بن چکی تھی۔ چونکہ وہ ایک گرلس اسکول کی نگراں تھی۔ اس لئے بھڑکدار کپڑا، زیور یا میکپ وغیرہ سے پرہیز کرتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مثالی بنا کر پیش کیا تھا۔

"ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جس کے رعب سے دوسری استانیاں لرزتیں اور لڑکیاں کانپ اٹھتیں۔" [۱]

شمن میں رحم دلی بھی موجود ہے۔ وہ دوسروں کے غم میں شریک ہوتی ہے۔ ان کی خوشی میں خوشی محسوس کرتی ہے اور غم میں غمگین ہو جاتی ہے۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتی ہے اور ان کی بدحالی کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ وہ اسکول میں نوکری کے دوران بہت سی غریب لڑکیوں کی فیس معاف کرواتی ہے۔ چپراسیوں

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۳۴۴

کی مالی مدد کرتی ہے اور غریب لوگوں کی اکثر مدد کرتی ہے۔

"اس نے دونوں چپراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپے دینا شروع کیے جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی۔" ط۱

اور

"گزشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے تھے اور کچھ طاقت کی دوائیں بھی۔" ط۲

افتخار کو نہ صرف گرم کپڑے اور دوائیں بھیجتی ہے بلکہ جب اس سے ملنے اسپتال جاتی ہے اس وقت بھی رحم دلی کی وجہ سے اس کا بل ادا کر دیتی ہے اور چلتے وقت

"سو سو کے چند نوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیئے۔" ط۳

اس کی دوست ایلما جب سینل کے بچے کی ماں بننے والی تھی وہ اندر سے ٹوٹ چکی تھی اپنے ضمیر کو زخمی کر چکی تھی۔ شمن نے بڑی ہمت سے اس کی دل جوئی کی اور اس کے بیٹے رولی سے اس کا میل بھی کرایا۔ نہ صرف اس نے ایلما کو مارل سپورٹ دیا بلکہ بچے کی پرورش میں بھی اس کی مدد کی۔ وہ دور بیٹھی ایلما کو بچوں کی پرورش کے متعلق کتابیں بھیجا کرتی۔

شمن کے اندر ایک خاص قسم کی بے چینی ہے، جستجو ہے، تڑپ ہے جو شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور شاید اس لیے کیوں کہ وہ نئے اور پرانے دور کو ملانے کی کڑی ہے۔ اس کے کردار میں دو تہذیبیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ پرانی روایت سے پوری طرح انکار نہیں کر سکتی اور نئے خیالات کا پوری طرح خیر مقدم بھی نہیں کر سکتی۔ یہ کردار اسی لئے بے چین ہے۔ ۵۰

فردوس علم اختتام

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصمت جس حد تک زندگی گزار چکی تھیں ایمانداری سے

ط۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی۔ ص ۳۹۴

ط۲ " " ۳۲۳

ط۳ " " ۳۴۰

بیان کر گئیں۔ شاہد لطیف (ان کے شوہر) نے لکھا بھی ہے کہ جس زمانے میں وہ ٹیڑھی لکیر لکھ رہی تھیں اس وقت ان کے یہاں پہلی ولادت ہونے والی تھی اسی لئے ناول کا خاتمہ شمن کے ماں بننے کے احساس پر ہی ختم ہوتا ہے۔ یہ عصمت کا کمال ہے کہ جس حد تک زندگی گزاری ہے اسی کا بیان کیا ہے۔ آگے وہ کچھ نہ لکھ سکیں ٹیلر کے ساتھ شمن کی لڑائی شاید خود عصمت اور شاہد لطیف کی لڑائی رہی ہو۔ ٹیلر کا گھر چھوڑ کر چلا جانا ہی اس ناول کا سب سے خوبصورت موڑ اور شمن کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے۔ یعنی اب وہ کیا کرے گی؟ اس جستجو کے ساتھ عصمت شمن کے کردار کو بھی ایک سوال ایک پہیلی بنا کر چھوڑ دیتی ہیں۔ گویا جیسا پڑھنے والا چاہے کردار کو اپنے سانچے میں ڈھال لے۔ کشن پرشاد کول کا یہ اعتراض کہ

"یہ شمن یعنی شمشاد ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ آزاد خیال اور آزاد روش لڑکی یعنی موڈرن گرل کی زندگی کی سیدھی سادی تصویر ہے۔ اس دن سے کہ جس دن وہ پیدا ہوئی اور جب تک کہ اس نے تھک کر شادی کر لی۔ گھر بار سنبھالا اور بچے جننے شروع کئے اس کی زندگی کی ایسی مکمل تصویر ہے کہ جس کا ہر خد و خال صاف نظر آتا ہے۔"[۱]

بابائے اردو عبدالحق نے اپنی لغت THE STANDARD ENGLISH - URDU DICTIONARY کے صفحہ ۷۲۷ پر MODERN کا مطلب یہ بتایا ہے۔ نئی روشنی کا شخص۔ جدید زمانے کا انسان۔ چاہے یہ کہانی موڈرن گرل کی ہو یا پھر نہ ہو یہ ایک بہادر اور جانباز لڑکی کی داستان ضرور ہے جس نے مصیبت میں آنسو نہیں بہائے۔ جس نے کسی کے دل دکھانے پر شکوہ نہیں کیا۔ جس نے پڑھ لکھ کر اپنے لئے راستہ کا انتخاب کیا۔ اسے آپ موڈرن گرل کہنا چاہتے ہیں تو اچھی بات ہے ورنہ یہ ایک ذہین لڑکی ہے جس کی ذہانت کو پہچانا نہ گیا اور

۱۔ نیا ادب کشن پرشاد کول ص ۲۴۴

اور جس نے خود اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی اس کی کہانی ہے۔

دوسری بات یہ کہ شادی تھک کر نہیں کی جاتی اور نہ ہی شمن نے کی بلکہ شادی سماجی، مذہبی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور شمن نے بھی اسی لئے شادی کی۔ کشن پرشاد کول کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ

"ناول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا کیونکہ موڈرن گرل کی واردات تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ قانون فطرت کا منشا پورا ہو جانے کے بعد تو پھر شمشاد کی حیثیت وہی معمولی ہندوستانی نسوانیت کی رہ جاتی ہے کہ جس میں عورت گھر بار سنبھالتی، بچے جنتی اور ان کی پرورش میں لگی رہتی ہے۔ چونکہ شمشاد موڈرن گرل رہ چکی ہے تو امید کی جاتی ہے کہ اس نے بچے جننے میں احتیاط برتی ہوگی۔"[1]

کشن پرشاد کا خیال کہ موڈرن گرل کو شادی سے لگاؤ ہوتا ہے مگر گھر گرہستی سے نہیں کیوں کہ اگر وہ بچہ پیدا کرتی اور پالتی تو موڈرن گرل کیسے ہوتی۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ موڈرن گرل بچہ پیدا کرنے سے نہیں کتراتی بلکہ زیادہ بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی جیسا کہ شمن کی ماں نے کیا۔ وہ بچہ کو پیدا کرنے کے بعد اس کا حق بھی دینا چاہتی ہے۔ اس کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتی ہے تو جیسا کشن پرشاد کا خیال ہے کہ اس نے بچے جننے سے گریز کیا ہوگا۔ وزن دار معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نے بچہ کو پیدا کر کے باقاعدہ پرورش کی ہوگی اور اسے مکمل انسان بنایا ہوگا۔ یہ قیاس آرائی کے علاوہ کچھ نہیں کہ شمن نے کیا کیا ہوگا اور کیا نہیں۔ کشن پرشاد کا خیال کہ

" یہ بات دوسری ہے کہ یہ بھی بغیر کہے نہیں رہا جا سکتا کہ موڈرن گرل کی جو تصویر ٹیڑھی لکیر میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ مایوس کن ہے نہ چہرہ مہرہ اور نقشہ ہی کچھ زیادہ اچھا ہے نہ نوک پلک ہی

---

[1] نیا ادب کشن پرشاد کول ص ۲۵۴

درست ہے نہ خد و خال دیدہ زیب نہ لب و لہجہ شیریں۔" [۱]

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عصمت ایک بہادر لڑکی کا ذکر کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسی مثال نہ تھی جس کی وہ نقل اتارتیں بلکہ وہ اس کردار کو بنا رہی تھیں، تخلیق کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کردار کو ویسا بنایا جیسا وہ خود چاہتی تھیں۔ ان کے نزدیک جو آئیڈیل تھا وہ لکھا۔ کشن کول صاحب کا یہ کہنا کہ ناول کی ہیروئن کے خد و خال نمایاں نہیں ہے، اس کی خوبصورتی کا بیان نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ عصمت چغتائی اس عورت کا ذکر کر رہی تھیں جس کے اندر خود اعتمادی، جد و جہد کا مادّہ اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہاں اس کے سراپائے حسن کا بیان مقصود نہیں۔

شمن کے کردار کے علاوہ جتنے بھی کردار اس ناول میں لائے گئے ہیں ویسے تو یہ سب ہی اپنی اپنی کہانی کہتے ہوئے اپنے غم میں مبتلا اپنے ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر یہ سبھی کردار شمن کو بنانے اور بگاڑنے میں مدد دیتے ہیں چاہے وہ آپا ہو، مس چرن، سنجو، انا، افتخار، ایلما، رائے صاحب، حسین بھی یا پھر اس کا شوہر ٹیلر کیوں نہ ہو۔ ان سبھی کرداروں نے یا تو شمن کے کردار کو بنایا ہے یا بگاڑا۔ شمن کا کردار بالکل پیاز کی طرح ہے۔ اس کا چھلکا اتارنا شروع کریں تو ہر تہہ کے بعد دوسری تہہ نکل آئے گی۔

شمن کے کردار کی اگر ایک ایک گرہ کھولی جائے تو آخر میں کچھ نہیں بچتا۔ مگر مجموعی طور پر وہ یقیناً ایک کامیاب لڑکی کہی جا سکتی ہے۔ اور کشن پرشاد کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

"امر واقعہ یہ ہے کہ عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں موڈرن گرل کی ہو بہو جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویر کھینچی ہے اور بڑے سلیقے سے۔" [۱]

---

[۱] نیا ادب — کشن پرشاد کول ص ۲۵۴

شمن موڈرن گرل تو ضرور ہے مگر موجودہ دور کی نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء کی۔ کیونکہ اس دور میں موڈرن اور فیشن ایبل جیسے الفاظ کے معنی آج سے مختلف تھے۔ اس لئے یہ موڈرن گرل کا ابتدائی نقوش کہی جا سکتی ہے۔ جس طرح اردو کے شروع کے ناولوں کو اگر ناول کی کسوٹی پر کسا جائے تو وہ ناول کم داستان زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شمن کا کردار موڈرن گرل کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا بلکہ کچھ کمیاں ضرور باقی رہ جاتی ہیں۔

شمن کے کردار کے علاوہ بھی اس ناول میں کچھ کردار ہیں، جو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کے بارے میں محمد احسن فاروقی کا خیال قابل غور ہے۔

> "پھر جتنے بھی کردار اس ناول میں لائے گئے ہر ایک اپنی طرف توجہ جذب کر لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ان سب میں بجلی کی سی لہر دوڑا دی ہے کہ ان کو چھوئے جانے سے جسم میں بجلی دوڑ جاتی ہے۔" [1]

عام طور پر ہم بھی زندگی میں ہزار طرح کے لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے ہیں عصمت نے ان سبھی کو بڑی باریکی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر کردار بھدے اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ ان کو بھی کہانی میں ایسا پیوست کرتی ہیں کہ ان کا بھدا پن چھپ جاتا ہے تبھی تو احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ

> "قوت تخلیق رکھنے والے ناول نگار کے کردار چاہے جتنے بھدے ہوں، چاہے جتنے نامکمل ہوں مگر ان میں جان ضرور ہوتی ہے۔ اور وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچ ضرور لیتے ہیں۔ ایک حد تک اس کی قوت بیان، اس کی قوت مکالمہ نگاری، اس کی قوت قصہ گوئی، کردار کی تخلیق میں مدد دیتی ہیں۔" [2]

عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں شمن کے علاوہ کچھ ایسے ضمنی کردار بھی پیش کئے ہیں جن کا ذکر کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شمن کے کردار کا۔ ایک موڈرن ترقی پسند

---

۱ ڈاکٹر احسن فاروقی اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ص ۱۳۳

۲ ،، ،، ،، ۲۴

لڑکی کے کردار کے ساتھ عصمت نے بوسیدہ رسم و رواج سے گھری روایتی لڑکی کے کردار کو بھی نہایت خاموشی سے پیش کیا ہے۔

"منجھو بی" شمن کی منجھو بی جس نے اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ والدہ نے پیدا کر کے اسے انا کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور جب انا اپنی بد چلنی کی وجہ سے قابل نفرت ہو گئی اور اسے نکال دیا گیا تب اس ننھی سی لاوارث لڑکی کو منجھو بی نے سنبھالا۔ ناول کے شروع میں منجھو بی ایک محبتی بہن کے روپ میں سامنے آتی ہے

منجھو بی ایک محبت کرنے والی بہن ہے اور صفیہ اختر نے اسے ایک ناتجربے کار ماں کہا ہے جو درست بھی ہے۔ منجھو بی صبح سے شام تک شمن میں لگی رہتی۔ وہ اس کے لئے ننھی فراکیں سیتی، اس پر کڑھائی کرتی اور شمن کو سجا بنا کر رکھتی۔ حالانکہ اس کو بچہ پالنے کا تجربہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ مادرانہ شفقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ شمن کو صاف رکھتی، کاجل سرمہ لگاتی اس کے لئے ٹوپیاں سیتی۔ غرض ایک ماں کا حق ادا کرتی۔

"منجھو نے اس کے لئے پھول جیسی فراکیں اور ٹوپیاں سیں، گھڑی گھڑی نہلایا جا رہا ہے "سرمے" کاجل اور مسی سے لیس۔"[1]

نہ صرف منجھو بی اس کے کپڑوں کا خیال رکھتی تھی بلکہ اس کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ وہ چاہتی ہے کہ شمن ایک اچھی لڑکی نکلے۔ وہ اس کو بڑے پیار سے سمجھا کر پڑھاتی بھی ہے۔ اس کے لئے "کتاب لاتی ہے اسے سیتی ہے" اور پڑھانے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ شمن کے بے تکے سوالوں کا جواب بہت پیار سے سمجھا کر دیتی ہے۔ منجھو شمن کو مارنے پیٹنے کے بعد اسے اپنے سینے کی گرمی سے اس کے زخموں پر مرہم بھی لگاتی۔ اور اس لئے وہ منجھو کی مار کو بھی بڑے پیار سے سہہ لیتی ہے۔

منجھو صفائی پسند لڑکی ہے وہ جب دیکھتی ہے کہ شمن دھول مٹی میں کھیل رہی ہے تو اسے اکثر سمجھایا کرتی اور اس خراب عادت کو چھڑانے کے لئے وہ اسے مارتی۔ منجھو کی خواہش تھی کہ شمن صاف ستھرا کپڑا پہن کر اچھے بچوں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر کوئی شریف بچوں کا کھیل کھیلے۔ مگر وہ اس کی بات نہ مانتی اور دھول مٹی میں کھیلتی۔ جانوروں کے باڑوں میں

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۵

جاتی اور نوکروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔

منجھو ایک جلاد قسم کی لڑکی بھی ہے۔ اس کو غصہ بات بات پر آتا ہے اور شمن پر ٹوٹ کر برستی ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر شمن کو بے انتہا مارتی ہے۔ اس کو اپنے غصہ پر قابو نہیں۔ چونکہ اسے بچہ پالنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لہذا وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں پاتی کہ چھوٹے بچوں کو کسی غلطی پر کتنا مارنا چاہیئے اور کب سمجھانا چاہیئے وہ شمن کو دھول مٹی میں کھیلنے پر کپڑا اگت دا کرنے پر، بالوں میں مٹی ڈالنے پر اور مٹی کھانے پر اسے خوب مارتی ہے وہ اپنا سارا غصہ ساری کھیج اور سارا اتناؤ شمن پر نکالتی۔ اور تب وہ ہمیں ایک جلاد اور ایک جذباتی لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہے اس کی ساری اچھائیوں پر یک لخت پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وقت بے وقت کی مار ہی شمن کو ضدی اور بدتمیز بنا رہی تھی۔ وہ زبان کی مٹھاس سے زیادہ ہاتھوں کی مار کا استعمال کرتی۔ مگر اس میں منجھو کی بھی غلطی نظر نہیں آتی کیونکہ اس کے وحشیانہ برتاؤ اور بے وقت کی مار کو گھر کے کسی بڑے نے برا نہ مانا اور نہ ہی اسے ٹوکا۔ اس طرح وہ سمجھ ہی نہ پائی کہ ایک بچے کو اس کی معصوم غلطیوں کے لئے کس حد تک مارنا چاہیئے۔ منجھو کو وحشیانہ مار غصہ ور مزاج کی وجہ سے ایک بے رحم عورت کے روپ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

> "سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں۔" [۱]

> "مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا۔ اس کے بعد تھپڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔" [۲]

---

[۱] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۵۔ ۱۶

[۲] " " " ۲۳

منجھو بی کا کردار ایک دم سے تبدیل تب ہوتا ہے جب ان کی شادی ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ شمن کو اپنے پاس سلاتیں، اس سے باتیں کرتیں، اس کی باتیں سنتیں اور اس کو پیار کرتیں۔ مگر جیسے ہی منجھو بی کی شادی ہوتی ہے ان کی محبت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ جب پہلی مرتبہ ہی میکے آتیں ہیں تب بھی شمن کو بہت دیر میں یاد کرتیں ہیں۔ مانا کہ شادی کے بعد لڑکیاں بدل جاتی ہیں مگر اس بدلنے میں بھی وقت لگتا ہے مگر منجھو بی تو شادی ہونے کے ساتھ ہی اس سے ایسی بے رخی دکھاتی ہیں۔ ان کی محبت، شفقت، لاڈ اور نخرے سب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے لوری شمن کو گھنگھن، گندی اور چڑیل کہتی رہی مگر منجھو نے ذرا بھی خیال نہ کیا اپنے پاس سلانا تو دور وہ اس کو اپنے پاس بھی نہ بٹھاتیں۔ وہ بیٹھی گھنٹوں اپنے شوہر ساس اور سسرالیوں کا ذکر کیا کرتیں۔ مگر شمن کو پاس نہ پھٹکنے دیتیں۔ منجھو بی کا ایکدم سے بدلنا ان کے کردار کو انوکھا بنا دیتا ہے۔

اس کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے شمن کو پالا پوسا اور اپنی ضد کی وجہ سے اسے بھی ضدی بنا دیا۔ شمن کے کردار کی کج روی منجھو بی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ ان کی پیار اور کڑی ہدایت نے اسے ضدی اور باغی بنا دیا تھا جو آخر تک قائم رہی اور حد تو یہ ہے کہ ان کی شوہر سے بھی نہ بنی۔ شمن کے کردار کو مکمل اور پختہ بنانے میں منجھو بی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

شمن کے کردار کو مکمل کرنے کے لئے منجھو بی کا کردار بہت ضروری ہے۔ یہی اس کردار کی خوبی ہے۔

"سنجھلی" شمن کی بہن ہے اور عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں کئی بہنوں کا ذکر کیا ہے۔ آپا بی، سنجھلی، منجھلی اور شمن ان سبھی بہنوں کے کردار میں فرق ہے۔ ہر کردار اپنی انفرادیت اپنی عادت اپنے خاص مزاج کو لے کر سامنے آتا ہے۔ جس طرح ایک گھر میں کئی بہنیں ہوتی ہیں۔ مگر الگ الگ مزاج اور عادت کی۔ اسی طرح یہاں بھی ہر بہن اپنی خوبی اور خامی کو لے کر سامنے آتی ہے۔

سنجھلی کا کردار نہایت خاموشی اور چپکے سے عصمت چغتائی نے پیش

کیا ہے۔ مسلم متوسط خاندان کی ایک سیدھی سادی لڑکی کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ جس طرح ایک عام لڑکی پیدا ہو کر چپ چاپ بغیر کسی کو پریشان کئے، بڑی ہو جاتی ہے۔ اور شادی کے بعد بچے پیدا کرنا، کھانا بنانا ہی وہ اپنا کام اور ایمان سمجھتی ہے۔ سنجھلی کا کردار بالکل ایسا ہی ہے۔ نہ اس نے کبھی ضد کی اور نہ کبھی کسی چیز کی شکایت۔ خاموشی سے پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور موت کو گلے لگالیا۔

"سنجھلی بچاری ان جانوروں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں، شریفوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں۔ پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے، پالے پوسے پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کرلی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ واہ کیا جنتی بیوی تھی۔ [1]

حالانکہ اس کردار کے ہونے یا نہ ہونے سے اس ناول میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کا کردار بہت معمولی معلوم ہوتا ہے۔ مگر عصمت اس کردار میں ہندوستان کے مسلم خاندان کی ان ہزاروں کروڑوں بے زبان لڑکیوں کی داستان بیان کر دیتی ہیں جو نہ کسی دکھ کی شکایت کرتی ہیں اور نہ ہی شکوہ۔ بے زبان گائے کی طرح زندگی گزارتی ہیں۔ شمن کے کردار کو مضبوط بنانے میں اس کردار کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ مگر یہ خود اپنے آپ میں مکمل اور اچھا کردار ہے۔

"بڑی آپا" شمن کی سب سے بڑی بہن جسے سب بڑی آپا کہہ کر پکارتے ہیں بڑی آپا نے اماں کی اتنی ساری اولادوں کو پالا پوسا تھا کہ جب شمن پیدا ہوئی اس وقت تک بچے پالتے پالتے ان کا دل بالکل بھر چکا تھا اور اسی لیے بڑی آپا نے شمن کی پیدائش پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے گالی دے کر فضول چیز قرار دیا۔ آپا کو شمن سے پیدائشی بیر تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ والدین بچہ پیدا کرتے اور بڑی لڑکیاں پال پوس کر بڑا کرتیں۔ بڑی آپا نے بھی اماں کے کئی بچوں کو پالا تھا مگر شمن کو وہ محبت نہ دے سکی۔

بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے والدین کی لاڈلی بھی تھیں اور اس پر سونے پہ

---

[1] ٹیڑھی لکیر۔ عصمت چغتائی ص ۶۰۔ ۶۴

سہاگا یہ ہوا کہ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئیں اور مستقل یہیں رہنے لگیں۔ بڑی آپا کے بچے بھی تھے وہ ایک اچھی بہو بنکر سسرال میں رہیں۔ عام ساسوں کی طرح ان کی ساس بھی انہیں خوب طعنے دیتیں اور ان کو شوہر کے ساتھ نہ رہنے دیتیں۔ بڑی آپا خاموشی سے اپنی ساس کی جلی کٹی باتوں، طعنوں اور طنزیہ جملوں کو ایک خاموش بہو کی طرح برداشت کرتیں۔ ساس کو جواب دینا ان سے زبان لڑانا یا پھر ان کی کہی باتوں کو برا ماننا شاید آپا نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ شوہر کے ساتھ وقت گزارنے کی ان کی زبردست خواہش ہوتی۔ مگر وہ اپنی سادگی کی وجہ سے خاموش رہتیں۔ شوہر کی باتیں نہ مانتیں، وہ روٹھ بھی جاتا۔ پھر بھی آپا اپنی ساس کی عزت کرتیں اور ان کے کہے پر چلتیں اور کبھی زبان سے شکایت نہ کرتیں۔ یقیناً وہ ایک اچھی ہندوستانی بہو ثابت ہوئیں۔ بڑی آپا اپنی ساس کی اکلوتی بہو تھیں۔ مگر اس کے باوجود ساس نے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ موقع بے موقع طعنے دیتیں۔ کام میں دن رات لگائے رہتیں۔ اور بے بات پر ٹوکتی رہتیں۔ مگر ایک لائق بہو کی طرح آپا سب کچھ برداشت کر جاتیں۔

بڑی آپا کے اندر ایک اچھی ماں کا دل بھی تھا۔ وہ لوزی اور منو کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہر ماں کو ارمان ہوتا ہے کہ ان کے بچے سب کو پسند آئیں۔ وہ انہیں نماز، روزہ، چھوٹی موٹی غزل سکھا دیتی ہیں تاکہ موقع پر اس کا استعمال کیا جا سکے۔ بڑی آپا نے بھی اپنے بچوں کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ شمن کو بد سے بدتر بنا دیا۔ بڑی آپا اپنی بیٹی اور بیٹے کا پورا خیال رکھتیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب وہ اپنی بیٹی کی شادی طے کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد ایک ذمہ دار ماں کی طرح اپنے سارے خرچ روک کر بیٹی کے جہیز کی تیاری کرنے لگیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بن باپ کی بیٹی کے لئے ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اسے ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے

مرنے اور جینے پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا، آپا کے شوہر کے انتقال کے بعد وہ بیوہ ہو کر گھر آگئیں تو گویا سب پر احسان کیا۔ وہ بار بار لوگوں کو اپنے بیوہ ہونے کی یاد دلاتی رہتیں، اور جتنا بھی فائدہ اس بیوہ ہونے سے ہو سکتا بڑی آپا نے بڑی چالاکی سے وصول کیا۔ وہ مکاری، جھوٹ، رونا دھونا اور ایسے سبھی ہتھیاروں

سے کام لینا جانتی تھیں اور بوقت ضرورت لیتی بھی تھیں۔

بیوہ ہونے کے بعد آپا کے کردار میں چالاکی، مکاری اور دکھاوا زیادہ آگیا تھا وہ تیوہار کے دن رونا پیٹنا مچاتیں۔ بار بار گھر والوں کو طعنے دیتیں۔ وہ سادہ کپڑا پہنتیں تو گویا گھر والوں پر احسان کرتیں۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ خود تو رنگین کپڑے چوڑیاں اور مہندی وغیرہ استعمال نہ کریں اور گھر کے سارے افراد استعمال کریں۔ یہ ان سے برداشت نہ ہوتا۔ عید وغیرہ کے موقع پر چوڑی والی کو دیکھ کر یا یسی مہندی کو دیکھ کر وہ اکثر رونا دھونا مچاتی تھیں۔ یہ کردار ان لوگوں میں سے ایک ہے کہ نہ ہم خود کھائیں گے نہ دوسروں کو کھانے دیں گے۔ ترنگ میں بھنگ ڈالنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اسی جلن میں کہ وہ جلدی کیوں بیوہ ہوگئیں ہیں۔ وہ دن بدن اور زیادہ بدمزاج ہوتی جارہی تھیں۔ آپا اس نظریہ کی حامی تھیں کہ چوں کہ وہ بیوہ ہیں اس لئے ہر کسی کو کچھ بھی کہہ دینا ان کا حق ہوگیا ہے۔

بڑی آپا حالانکہ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور سب کے دکھاوے کے لئے ان کا دل بھی شوہر کی موت کے ساتھ مرگیا تھا۔ مگر اس دکھاوے کے باوجود وہ اپنی خوب صورتی اور رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ان کی سادگی میں بھی رنگینی چھپی رہتی۔

> "کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھیں تو انھوں نے بالکل سنیاس ہی لے لیا تھا۔ اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ وہ کھل اٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دلہن کا سہاگ کا جوڑا بھی ماند پڑ جاتا۔ سفید کریپ یا شفان کا دوپٹہ جس پر بچاری بڑے نازک سی کلی کی بیل چیکالیتی سفید چکن کا کرتا، سارا گلا مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے ...... پھندنے ______ ہاں پجامے پر رنڈاپا اتارنے کی ضرورت نہیں سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھول دار پجامہ ہاتھوں میں وہی رنڈاپا اتارتے وقت جو ماموں نے دو۔ دو نازک سی بانکیں ڈال دی تھیں۔ بڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرد کی انگشتری اور بس۔ ہاں سنجلی بوا اگر کبھی زبردستی اور بڑے

پہنا دیتی تو خیر ورنہ وہی اپنی موتیوں کی لونگیں پڑی رہتیں۔ سیاہ گرگابی
اور سفید پھول دار موزے، ریشمی ہوئے تو ریشمی ورنہ سوتی ہی سہی

. . . . . . پر اس کا اپنا ہی دل مردہ ہو گیا تھا۔ اس لئے بال اوپر
چڑھا کر پھولے پھولے گچھے کانوں پر چھوڑ دیتی بس اتنے نیچے کہ کانوں
کی لونگیں جھانکتی رہیں۔ روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئی تھیں اس
لئے کہیں آتے جاتے وقت سنہری زنجیر والی عینک لگا لیتی تھی۔"[1]
آپا دیکھنے میں اچھی خاصی تندرست تھیں مگر جب سے ان کا دیور رشید ڈاکٹری پاس کرکے
آیا تھا۔ بڑی آپا بیمار پڑی رہتیں اور صرف رشید سے روز ملاقات ہو سکے۔ اس لئے
روز نئے نئے مرض میں مبتلا رہتیں وہ رشید سے عشق لڑانے لگیں تھیں۔ حالانکہ رشید
سے ان کا رشتہ دیور بھابی کا تھا۔ مگر بڑی آپا کا عشق بھی چلا۔ بڑی آپا ایک چالاک عورت
تھیں۔ خوب جانتی تھیں کہ بھرے پورے گھر میں سب کے سامنے رشید سے روز نہیں مل
سکتیں۔ اس لئے بیماری کے بہانے ہی وہ رشید سے ملنے کے مواقع نکال لیتی تھیں
بڑی آپا رشید پر اپنا پورا حق جتاتیں کیوں کہ وہ ان کے سسرال کا تھا۔ جب گھر
کا کوئی اور رشید سے اپنے مرض کا علاج کرنے کو کہتا تو انہیں بہت برا معلوم ہوتا۔ جب
بڑی آپا کی بیماری کا راز فاش ہو گیا اور . . . . ایکا ایک بڑی آپا کی مصنوعی بیماری
ٹھیک ہو گئی۔

"غضب تو تب ہوا جب انھوں نے اس کے خط پکڑ لئے اور صاف بڑی
آپا سے کہلوا دیا کہ اگر یہ پٹے بازی بند نہ ہوئی تو ابا جان تک نوبت پہنچ جائیگی۔"[2]
مگر رشید سے چھوٹنے کے بعد بھی ان کی جنسی خواہش باقی رہی اور اس بار انہوں نے بہت سوچ
سمجھ کر عزیز بیگم سے دو پٹہ بدل رشتہ قائم کر لیا تھا۔ یہاں یہ "ہم جنسیت"، کا شکار نظر
آتی ہیں۔

۱؎ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص — ۵۲
۲؎ ״ — ״ — ״ — ۶۶

"بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اسکی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی۔ عزیز بیگم کے میاں انہیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر وہ تو بڑی آپا سے دوپٹہ بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں"۔ [۱]

بڑی آپا کے کردار کا ایک پہلو وہ بھی ہے جہاں وہ نوری کے لئے لڑکے پھنسانے کا کام کرتی ہیں اور نوری کو اس کے لئے کئی بار استعمال بھی کرتی ہیں۔ بڑی آپا نے اس وقت اپنا چولا بالکل بدل دیا جب ان کی بیٹی جوان ہونے لگی تھی اور انہیں اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ وہ ایک ہوشیار ماں کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

"ساس اور بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی یتیمی کا سارٹیفکٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ اودھم مچائی مگر ایک نہ چلی"۔ [۲]

حالانکہ آپا کا کردار عام کردار معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی نفسیاتی الجھنوں کا بیان عصمت نے بہت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔

مجموعی طور پر ٹیڑھی لکیر میں آپا کا کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کی وجہ سے انفرادیت قائم رکھتا ہے اور جیتا جاگتا کردار معلوم ہوتا ہے۔

رائے صاحب

رائے صاحب پریما کے والد تھے۔ ان کا کردار بہت مختصر مگر اہم ہے رائے صاحب کا اثر شمن کی شخصیت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف رائے صاحب کی شفقت اور محبت کو غلط سمجھتی ہے بلکہ ان سے اپنے عشق کا اظہار بھی کر لیتی ہے اس کردار کے اندر کئی شخص چھپے نظر آتے ہیں۔ کہیں پر رائے صاحب ایک ذمہ دار باپ نظر آتے ہیں، کہیں اچھے دوست، کہیں فلسفی اور کبھی آرٹ کے دلدادہ۔ ان کا کردار تہہ دار (ROUND) کردار ہے اور ایسے کرداروں کو اچھے کردار کے دائرے

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۱۴۱

۲ " " ۲۱۱

بکمار کہا جاتا ہے۔ رائے صاحب حالانکہ بوڑھے ہیں مگر ان کی جسمانی کشش متاثر کرتی ہے۔ رائے صاحب ایک خوب صورت شخصیت کے مالک ہیں

"خوب صورت مضبوط مگر چھریرا جسم، اونچا قد اور تپے ہوئے سونے جیسا رنگ، اس پر چاندی سے بھی زیادہ اجلے بالوں کا ڈھیر"۔[۱]

ان کا قد اونچا، گٹھا ہوا کسرتی جسم، گھنے خوب صورت بال جو آدھے کالے اور آدھے سفید ہیں۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، ذہانت کے نشے میں چور، چوڑا سینا اور اس پر سڈول باہیں دیکھ کر شمن کو وہ کوئی زردجی دیوتا معلوم ہوتے، رائے صاحب کی شخصیت ہی ایسی جاذب نظر تھی جو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور یہی وجہ تھی کہ شمن جو اعجاز اور نریندر جیسے اپنے ہم عمر نوجوان لڑکوں سے متاثر نہ ہوئی تھی رائے صاحب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ انہیں پوجنے لگی تھی۔ رائے صاحب شمن کو دیوتا معلوم ہوتے تھے۔

رائے صاحب کی بیوی کا انتقال ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر اپنے بچوں کی محبت کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ جب کہ ان کی پرانی محبوبہ بھی موجود تھیں اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اب بھی ان کا "مس فلپ" سے عشق چل رہا تھا کیوں کہ اکثر وہ بہت غصہ اور اداس ہو جایا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ "مس فلپ" کا اب بھی ان پر رعب تھا اور وہ ان سے متاثر تھے۔ پریما اور شمن کی بات چیت سے رائے صاحب اور مس فلپ کے تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"شاید مس فلپ سے لڑائی ہو گئی۔ وہ بھی تو شکار کو گئی تھیں، پریما نے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

"کون ہیں یہ مس فلپ"؟ ہیں ایک، ایک انسپکٹریس آف اسکول ہیں، رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں

---

[۱] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۱۶۲

دو دن میں شادی بھی کر ڈالی "۔ ط۱

جہاں رائے صاحب کا کردار ایک جذباتی نوجوان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ اپنی منگیتر کو چھوڑ کر وہ دو دن میں ہی کسی اور لڑکی سے متاثر ہو کر شادی کر لیتے ہیں "مس فلپ" سے ان کا عشق بعد میں بھی باقی رہتا ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوتے بھی رائے صاحب اس سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔

" ہاں تو، ممی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آکر بیٹھا کرتی تھیں "۔ ط۲

بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ کر ہی شادی نہ کی۔ رائے صاحب ایک ذمہ دار زندہ دل اور اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشی کو پورا کرنے والے ایک باپ بن کر قاری کے سامنے آتے ہیں حالانکہ قاری کو ان کی محبت میں کبھی کبھی چھچھوراپن بھی نظر آتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے، تیراکی کرتے ان سے ہنسی مذاق کرتے ان کے ساتھ چاٹ کھاتے اور اس قدر گھل کر ملتے جیسے ایک دوست۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ ہی نظر آتے۔

"پر ہما کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ دونوں بچوں کے لئے سب کچھ بن کر رہ گئے "۔ ط۳

" انہیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا ۔ ط۴

رائے صاحب اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی خوشی کے لئے وہ ان کے اچھے دوست بن جاتے اور ان کے ساتھ بالکل انہی کی طرح باتیں کرتے۔ ان کی محبت

ط۱	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص۔	۱۹۴
ط۲	"	"	"	۱۹۴
ط۳	"	"	"	۱۸۹
ط۴	"	"	"	۱۸۹

میں بناوٹ نہ ہوتی مگر قاری کو اجنبیت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ رائے صاحب جیسے باپ کا منفرد کردار عصمت چغتائی ہی تراش سکتی ہیں۔

رائے صاحب اپنے بچوں سے بہت بے تکلف تھے۔ پریما کو گود میں اٹھا لینا اپنے اوپر بیٹھا لینا اس کے گالوں میں تنکا چبھانا، گد گدی کرنا ان کے ساتھ کھیلنا اور ہنسنا انہیں بہت پسند تھا۔ بچوں کے سامنے وہ بچہ بن جاتے اور خوشی مناتے۔ وہ بچوں سے ایسی دوستی کرتے ہیں جیسے وہ ان کے ہم عمر ہوں۔ بے تکلفی کی انتہا تو یہ ہے کہ وہ آپس میں گالیاں بھی بڑی بے تکلفی سے دے دیتے ہیں۔

صرف اپنے بچوں سے ہی نہیں بلکہ پریما کی دوست شمن سے بھی وہ بہت جلدی بے تکلف ہو گئے اور اسے بھی پریما کی طرح پیار کرنے لگے۔ حالانکہ ان کی محبت پاک تھی مگر چونکہ اس قسم کی عجیب و غریب محبت سے شمن کا کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ اس وجہ سے وہ ان کی محبت سے پریشان ہو جایا کرتی۔

رائے صاحب بچوں کی خوشی کے واسطے ان کو کہانیاں بھی سنایا کرتے اور اس وقت بالکل معصوم معلوم ہوتے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ کیونکہ وہ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ہر فن مولا بھی۔ اس لئے کہانی کہتے وقت وہ بالکل بچہ بن جاتے۔

"کچھ لوگ تو انہیں چھچھورا کہتے تھے اور بعض انہیں فلسفی مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ شمن کو وہ ناروجی اوتار معلوم ہوتے"۔[1]

رائے صاحب کے کردار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ انہیں فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ ایک اچھے موسیقار، ڈانسر اور مصوّر ہیں۔ جب موڈ ہوتا ہے کسی راگ کو چھیڑ دیتے اور گایا کرتے وہ اچھی آواز کے مالک ہیں۔ اور راگوں کی انہیں اچھی پہچان بھی ہے۔ گھنٹوں ناچتے اور فرصت کے وقت تصویریں بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انہیں ان سب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ ریاضت بھی اچھی تھی اگر رائے صاحب کو آرٹ کا شیدائی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

رائے صاحب کو خود بھی گانے کا شوق تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے بھی ہندوستانی

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۸۹

کلاسیکی راگ سے واقف ہوں۔ تبھی تو ایک روز وہ اپنی بیٹی کو فلمی گانا گاتے سن کر برہم ہو گئے تھے۔

" رائے صاحب نے اسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت کرنے لگے۔ راگ راگنیاں بھول کر وہ ٹیں ٹیں میں پڑتی جا رہی تھی۔
طنبورا اٹھا کر انہوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے نیچے سے تال دیتے جاتے . . . . نہ جانے کیا سر تھے۔ دھیمے اور نرم جو احساسات پر پھوار کی طرح برستے رہتے۔ " ۱

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رائے صاحب ایک زندہ دل باوقار اور تعلیم یافتہ انسان شفیق باپ اور اچھے دوست کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ ان کے کردار میں ایک عجیب سی کشش ہے اور چھچھورا پن بھی۔ رائے صاحب کا کردار حالانکہ مختصر ہے مگر مکمل ہے اور ارتقائی منزلوں سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے کردار کے بارے میں کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ جو قاری کو متاثر کرتی چلتی ہے اور آہستہ آہستہ قاری بھی انہیں پسند کرنے اور چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موت پر شمن کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی صدمہ پہنچتا ہے۔ رائے صاحب کا کردار ٹیڑھی لکیر کا ایک منفرد اور یادگار کردار ہے۔

عام طور سے کرداری ناول میں ایک ہی کردار اہم مانا جاتا ہے۔ باقی سب اس ایک کردار کو بنانے یا بگاڑنے کے لئے لائے جاتے ہیں ویسے تو اس میں کئی ایسے کردار ہیں جنہوں نے شمن کی زندگی کو متاثر کیا۔ مگر افتخار ایک ایسا کردار ہے جو کافی عرصہ تک شمن کی زندگی میں چھایا رہا۔ اور شمن اس کی شخصیت سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر کے کرداروں کے بارے میں اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

" شمن کے علاوہ اس ناول کے دوسرے تمام کردار ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ضمنی کرداروں کو ناول نگار نے شمن کے کردار کو سب سے زیادہ

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۸۶

موثر اور مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے
موقع و محل میں بالکل موزوں اور مناسب ہیں۔"[1]

افتخار عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ کردار بذات خود پر کشش اور مضبوط ہے یہ شمن کے کردار کو بھی بخوبی پختہ بناتا ہے۔ اس کردار کے کئی پہلو ہیں۔ کہیں وہ سیاسی لیڈر کہیں ہنس مکھ نوجوان کبھی وہ ذہین اور کبھی فراڈ نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کی شکل صورت اچھی نہیں ہے تاہم اس میں کشش ہے۔ اس کو دق کی بیماری لگی ہے مگر اس کے باوجود شروع میں قاری کو اس کردار سے بہت ہمدردی ہو جاتی ہے۔ مگر جب آخر میں اس کی بیوی حسین بی آکر اس کردار کا دوسرا روپ دکھاتی ہے جس سے قاری پہلے آشنا نہیں تھا تب اس سے ایکا ایک ہمدردی ختم ہو کر اس کی جگہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کردار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے اور ایک شخصیت دوسری شخصیت سے مختلف ہے بالکل سیاہ و سفید کی طرح۔

افتخار ایک ذہین اور خوش مزاج لڑکا ہے وہ جس محفل میں بیٹھتا ہے سب پر چھا جاتا ہے لوگ اس کی آمد پر خوش ہوتے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے محفل کے لئے اہم بنا دیتا اس کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا متاثر کن معلوم ہوتا ہے۔ شمن جب پہلی مرتبہ کالج کی پارٹی میں شریک ہوتی ہے اس وقت وہ بالکل نئی تھی۔ اس ماحول کے لئے اور اس کا پارٹنر بھی۔ ان دونوں کو بور ہوتے دیکھ کر افتخار ان کے بیچ پہنچ جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں کرتا ہے کہ دونوں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ اس پارٹی سے گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے۔

"افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف بنا دیا۔"[2]

"افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ شمن کو جیسے گدڑی کی پوٹلی سے نکال کر
اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔"[3]

---

[1] اردو ناول آزادی کے بعد — اسلم آزاد — ص ۱۳۹
[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۸۰
[3] " — " — ص ۲۲۹

شکل و صورت کے لحاظ سے افتخار نہایت معمولی تھا۔ مگر اس کے پاس گفتگو کی ایسی طاقت تھی کہ وہ جب چاہتا بڑے سے بڑے بھڑ کے ہوتے مجمع کو خاموش کر دیتا اور جب چاہتا خاموش لوگوں میں فساد کی چنگاری لگا دیتا۔ افتخار اپنی چرب زبانی کے بل پر ہی کالج میں سب پر رعب ڈالتا تھا۔ کالج میں پرنسپل سے لے کر طالب علم بھی اس کے رعب میں رہا کرتے۔ کالج کے ہر کام میں وہ پیش پیش رہتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر دل عزیز بھی تھا مگر اکثر لوگ اس کے بارے میں یہ رائے بھی رکھتے تھے کہ یہ مکار قسم کا آدمی ہے اور اپنے مطلب کے لیے جیتا ہے۔

"بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکار تھا۔ اس کی زبان اس قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا۔ مگر جونہی دل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا، بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا۔ اسی لیے منتظمین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔" [1]

لیکن افتخار اپنی صلاحیتوں کا استعمال کم سے کم اور بدتر جگہوں پر کرتا ہے۔ وہ سوچنے میں بلند خیالوں اونچے خوابوں کا مالک ہے۔ اس کے احساسات بلند ہیں مگر عملی طور پر وہ کمزور ہے اور اپنے سوچنے کا ایک تہائی حصہ بھی پورا نہیں کرتا۔ ایما اس کے بارے میں کہتی ہے

"یہی دیکھو افتخار کتنا جوشیلا کتنا سچا ہے مگر صرف وہاں تک جہاں تک تھیوری کا سوال ہے وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی عمل کی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا نہ جانے کیا ہو جاتا۔" [2]

افتخار کو اپنے والدین اور خاندان سے بہت محبت ہے۔ وہ اکثر اپنے گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرتا ہے۔ اس کا بچپنا بہت غریبی میں گزرا۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ایک بہن بھی اور والدہ۔ مگر جلد ہی وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ اکثر ان لوگوں کو یاد کرتا۔ ایسا معلوم

۱۔ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۳۷

۲۔ ایضاً " ۲۶۹

ہوتا تھا کہ وہ ان رشتوں کو ابھی تک بھول نہیں پایا ہے۔ اس کی باتوں سے محبت کا
اندازہ ہوتا ہے۔

انتظار کو سیاست سے بھی لگاؤ ہے وہ چاہتا ہے کہ ملک آزاد ہو مگر وہ
کس کیلئے کیا کام کرتا ہے معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اس کی باتیں اکثر ادھوری اور بے تکی
ہوتی تھیں۔ وہ شمن سے کئی بار اپنے گروہ کے بارے میں ذکر کرتا ہے اور جیل بھی
جاتا ہے۔ مگر کسی وجہ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک
کی آزادی کے لئے کام کرتا ہے۔ اسے سیاست سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ شمن سے
سیاسی گفتگو بھی کرتا ہے۔

انتظار ایک عاشق مزاج اور رومانی نوجوان کے روپ میں بھی سامنے آتا ہے
وہ شمن کو دل و جان سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ایک ایک پل کی خبر جیل اور سینی ٹوریم
میں رکھتا ہے۔ وہ کئی بار چند منٹوں کے لئے شمن سے ملنے بھی آتا ہے۔ اسے برابر خط
لکھتا ہے۔ مگر اس محبت میں جسم کہیں شامل نہیں۔ وہ زبانی محبت کرتا ہے ایک پاک
اور صاف محبت۔ ایک لمبی مدت تک شمن سے دوستی رکھنے کے باوجود بھی اس کا ہاتھ
تک نہیں تھامتا۔

ٹیڑھی لکیر میں حسین بی کی آمد سنسنی خیز طریقہ سے ہوتی ہے اور اس سے
انتظار کی قلعی اتر جاتی ہے اور قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف شمن کو اپنے جال
میں پھنسائے ہوئے تھا بلکہ اس کے جیسی کئی اور لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو اس کے جال میں
پھنسی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دھوکے باز آدمی ہے۔ اس کی محبت کی پاکیزگی اس کی میٹھی باتیں اور
اونچے خیالات سب چھچھورے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کی بیوی اور تین بچے تھے مگر
اس کے باوجود کئی لڑکیوں سے بہ یک وقت عشق کیا کرتا تھا اور سب سے تحفے روپئے
سے وصول کرتا تھا۔ حسین بی کی باتوں سے شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان دونوں کی ملی بھگت
تو نہیں کہ انتظار محبت کے خطوط لڑکیوں کو لکھے اور اس کی بیوی لڑکیوں کو بلیک میل کر کے پیسے
وصول کرے۔ کیونکہ انتظار ایک تو دق کا مریض تھا۔ دوسرے نوکری بھی نہیں کرتا تھا۔ اس لئے
آخر میں قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ عشق بازی کا چکر صرف پیسہ وصول کرنے

کے لئے تو نہیں چلتا تھا۔ افتخار کا کردار اور اس کی بیوی کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

"حسین بی" افتخار کی بیوی ہے۔ تین بچوں کی ماں۔ اس کی آمد ناول میں تب ہوتی ہے جب افتخار شمن سے آخری بار ملنے آتا ہے اور یہ کہہ کر چلا جاتا ہے کہ پتہ نہیں اس بیماری (T.B) سے نجات بھی ملے یا نہیں۔ اس کے بعد حسین بی کی آمد دماغ میں ایک شک بھی پیدا کر دیتی ہے۔

چند مکالموں اور حادثات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افتخار کے اپنی بیوی سے اچھے تعلقات بھی تھے اور اس کی بیوی اس کی ہر بات کو جانتی بھی تھی۔ کیوں کہ ایسا نہ ہوتا تو شمن یا پھر اور لڑکیوں کے خطوط حسین بی کے پاس کیسے موجود ہوتے۔ دوسرے یہ کہ وہ شمن کے پاس رات میں چند گھنٹوں کے واسطے آیا تھا۔ اس بات تک کی جانکاری حسین بی کے پاس تھی۔ افتخار کو اپنی بیوی بچوں کا خیال بھی تھا۔ اس لئے اس نے روپے بھیجے تھے اور اور اپنے کئی پرانے سوئیٹر بھی۔

"پارسال سو روپے دے گیا تھا ..... دو سوئیٹر بھی دیئے تھے کہ ادھیڑ کر بچوں کے بنا لے تو میں نے منے اور اسلم کے لئے بنا دیئے۔"[1]

ان باتوں سے ایسا شک پیدا ہوتا ہے کہ حسین بی اور افتخار دونوں مل کر معصوم لڑکیوں کو پھنساتے اور بلیک میل کر کے دولت وصول کرتے ہیں۔

حسین بی ایک ڈھیٹ، مکار اور چالاک عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے حالانکہ وہ رو رو کر یہی کہتی جاتی ہے کہ اس کے اپنے شوہر سے خراب تعلقات ہیں اور افتخار ایک فراڈ انسان ہے لڑکیوں کو پھنساتا ہے مگر اس کے باوجود وہ خود ایک ڈھیٹ عورت ہے وہ شمن کے گھر بڑی دھونس کے ساتھ گھس آتی ہے اور جب شمن اسے بھگانے کی کوشش کرتی ہے تو حسین بی صاف صاف کہہ دیتی ہے

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۳۶۵

کہ مجھے ان گیدڑ بھبکی سے مت ڈراؤ اور جو کچھ مجھے کہنا اور تم سے سننا ہے سب کہہ سن کر ہی واپس جاؤں گی وہ شمن کی دھمکیوں کو ہنس کر ٹال دیتی ہے

حسین بی شمن کو اس کا خط دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دیتی ہے کہ وہ اس کے گھر والوں کو بھی بھیج سکتی ہے۔ اس سے گھر والوں کی عزت میں بٹہ لگ سکتا ہے۔

اس نے شمن کو بتایا کہ تم افتخار کو روپیہ بھیجتی رہی ہو۔ حلوہ بنا کر بھیجا اور سوئٹر بن کر دیا۔ جب شمن خوف کی وجہ سے خود افتخار کی محبوبہ ہونے سے انکار کرتی ہے تو وہ بڑی چالاکی سے شمن کو پست کر دیتی ہے۔

"جھوٹ نہ بولو ...... میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں" ؎

شمن کو خط دکھاتے وقت وہ بڑی چالاکی اور مکاری سے یہ بتا دیتی ہے کہ خط چھیننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ برا ہوگا۔ شمن کا خط ڈھونڈنے کے لئے وہ ایک بڑے تھیلے میں سے کئی بنڈل نکالتی ہے۔ یہ سبھی خط افتخار کی محبوباؤں کے تھے۔ حسین بی نہ صرف یہ جتا دینا چاہتی تھی کہ شمن کے بارے میں اسے سب معلوم ہے بلکہ اور لڑکیوں کے جو تعلقات افتخار کے ساتھ ہیں وہ بھی اسے اچھی طرح معلوم ہیں۔ حسین بی بڑی چالاکی سے شمن کو بلیک میل کرتی ہے۔ نہ صرف اس کے محبت بھرے خطوط دکھاتی ہے بلکہ ایسی باتیں بھی کر دیتی ہے جس سے اسے شرمندگی ہو۔ اور حسین بی ایک "سپرنٹنڈنٹ صاحب" کی بیوی کا قصہ بھی نہایت صفائی سے بیان کر جاتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط پانے کے لئے اپنے زیورات دینے کی کوشش کی۔ مگر حسین بی نے اس ڈر سے زیور نہیں لیے کہ کہیں وہ اپنے شوہر سے کہہ کر جیل کی ہوا نہ کھلا دے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حسین بی خط کے بدلے عورتوں کو بلیک میل کرتی ہے۔ وہ شمن سے بھی اس کے زیورات اتروا لیتی ہے۔ اس طرح وہ ایک تربیت یافتہ ٹھگ کی طرح نظر آتی ہے۔

؎ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۳۶۲

"یہ بندے تو اچھی وضع کے ہیں۔ بہن لول، کان بوچے لگتے ہیں
چوڑیاں دلی کی بنی معلوم ہوتی ہیں کیوں ؟ "۔[1]

حسین بی کی آمد اس ناول میں نہ صرف افتخار کے کردار کو مکمل کرتی ہے بلکہ بلیک میلنگ کی عبرت ناک مثال بھی پیش کرتی ہے۔ افتخار اور حسین بی کے کردار اپنے عمل اور رد عمل کے باعث بے حد دلچسپ اور اہم قرار دیئے جاسکتے ہیں جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث ناول میں ایک نئے موڑ کے غماز بھی ہیں۔

رشید شمن کی سہیلی بلقیس اور ان کی چار بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی تھا۔ اس کی شکل صورت عام سی تھی مگر بات کرنے میں ماہر تھا۔ اپنی بہنوں کی دوستوں سے رومانس کرتا ہوا ایک رومانی مرد کے روپ میں نظر آتا ہے۔ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا، ان سے رومانس کر کے وقت کاٹنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہ خود پڑھائی میں کمزور تھا مگر ٹیوشن پڑھانے سے کبھی انکار نہ کیا۔ اور اسی بہانے ان لڑکیوں سے خوب رومانس کرتا۔ شمن اور اس کے بعد نسیمہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ رشید ایک بے فکر نوجوان کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت صرف اتنی سی ہے کہ پرنسپل صاحب کا اکلوتا بھائی شمن کا پہلا دوست یعنی عاشق بھی ہے۔ جس نے پڑھائی کے دوران ہلکا پھلکا رومانس کیا اور پھر بھول گیا۔

سب سے پہلے وہ ایک رومانی نوجوان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے شمن سے اس کی ملاقات پکنک کے دوران ہوئی تھی اور اپنے کھلنڈرے پن کی وجہ سے اس نے شمن کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے بعد بلقیس کی جشن پیدائش کے موقع پر ہوئی تھی بعد میں وہ شمن کو حساب پڑھانے لگا تھا۔ اس دوران وہ پڑھاتا کم اور رومانس زیادہ کرتا تھا۔

"شمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے۔ جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے"۔[2]

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی۔ ص ۳۶۸
[2] ،، ،، ص ۱۱۵

صرف یہی نہیں بلکہ وہ نسیمہ کے آنے کے بعد شمن کو چھوڑ دیتا ہے اور پھر سارا وقت نسیمہ پر خرچ کرتا ہے۔ اس طرح وہ عاشق مزاج نوجوان ہے۔ شمن اور نسیمہ ہی نہیں بلکہ اس نے جس اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی تھی اور کر رہا تھا وہاں ایک ساتھ کئی لڑکیوں سے دوستی کرتا ان کے ساتھ اپنا وقت اچھے سے اچھا گزارنے کی کوشش کرتا اور آگے بڑھ جاتا رشید بے فکرا مطلب پرست اور من موجی لڑکے کے روپ میں ناول کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں کشش تھی اور زبان میں مٹھاس لڑکیاں اس پر ہمیشہ جان دینے کو تیار رہتیں اور کچھ امیر خاندان کی لڑکیاں تو اس سے صرف اس لئے ٹیوشن لیا کرتیں تھیں کہ رشید سے ملنے میں سہولت ہو جائے۔

"___ جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑ دیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں ___"[۱]

رشید کا کردار اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ پہلا لڑکا ہے جس سے شمن متاثر ہوتی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ شمن کے کردار کو مکمل کرنے میں رشید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ویسے یہ کردار بذات خود زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ ان نوجوان کھلنڈرے لڑکوں کی تصویر پیش کرتا ہے جو ایک ہی درجہ میں کئی کئی سال فیل ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ٹیوشن کر کے لڑکیوں کو ضرور پاس کروا دیتے ہیں۔

رونی ٹیلر ٹیڑھی لکیر کے مرد کرداروں میں سب سے زیادہ اہم کردار ہے۔ یہ آئرلیش نوجوان ہندوستان میں انگریزوں کی نوکری کرتا ہے۔ اس کا کردار شروع سے آخر تک مستقل بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ ایک جذباتی اور محبت کرنے والے نوجوان کے روپ میں نظر آتا ہے تو کبھی ہندوستانی کلچر اور ادب کا دلدادہ وہ اپنی بیوہ ماں اور بہن کو بہت چاہتا ہے اکثر اپنے بچپن کے گزرے سنہرے دن کی یاد کیا کرتا۔ رونی ٹیلر اپنے دل میں ہندوستانیوں کے لئے رحم کا جذبہ رکھتا ہے ہندوستانی سیاست سے اسے بہت گہرا لگاؤ ہے وہ اکثر

---

[۱] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۱۷

ہندوستانیوں اور یہاں کی سیاست کے لئے فکر مند ہو جاتا ہے۔

عام طور پر عصمت کے ناولوں میں مرد کردار ضمنی حیثیت ہی رکھتے ہیں جتنے کردار ہیں ضمنی طور پر۔ ٹیلر کا کردار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس کے کردار کے کئی پہلو ہیں جو وقت وقت پر اجاگر ہوتے ہیں سب سے پہلے وہ ایک نرم اور خوش مزاج نوجوان نظر آتا ہے۔ وہ تیکھی سے تیکھی طنزیہ باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا ہے اسے معلوم ہے کہ ہندوستان میں سفید چمڑی کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس کے باوجود وہ یہاں کے لوگوں میں محبت تلاش کرتا ہے۔ شمن سے کئی بار بحث بھی ہو جاتی ہے۔ شمن اسے جلی کٹی سنانے سے کبھی نہیں چوکتی اس کے باوجود وہ شمن کو چاہتا ہے۔ اور اس کی باتوں کو ہنس کر برداشت کر جاتا ہے۔ وہ ایک "نرم مزاج" کا آدمی ہے جو زندگی کو ہنسی خوشی گذارنے کا قائل ہے۔

روفی ٹیلر اپنی بیوہ ماں سے بہت محبت کرتا ہے اس کی ماں کا کردار حالانکہ صرف خطوط کے ذریعہ ناول میں ابھرتا ہے۔ مگر اس سے ٹیلر کی محبت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ شمن سے شادی سے پہلے اور بعد میں بھی اکثر گزرے دنوں کو یاد کرتا اور بہن اور والدہ کی محبت کا ذکر کرتا ہے۔ ماں کے خط کو دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ جیسے کوئی چھوٹا بچہ۔ وہ اپنی منگیتر کو بھی یاد کرتا ہے اور اس کے جواب نہ دینے پر بھی وہ بار بار خط لکھتا ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھا ٹیلر صرف اپنی والدہ کی محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو مضبوط اور خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔

روفی ٹیلر ادب سے خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ اسے نہ صرف انگریزی ادب سے لگاؤ ہے بلکہ عربی شاعری سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ شادی کے بعد وہ اور شمن ادب سے متعلق باتیں کیا کرتے۔ بحث ہوتی، ایک دوسرے کی پسند ناپسند پر تنقیدیں ہوتیں کہیں پیڑ کے سائے میں شعر و شاعری کی جاتی اور دونوں اسی میں غرق رہتے۔ اسے کیٹس بائرن عمر خیام اور شیلے کی تخلیقات بہت پسند تھیں۔

وہ آئرش ہوتے ہوئے بھی، مرچ مصالحہ اور چٹ پٹے کھانے کا شوقین ہے۔ اسے ہندوستانی کلچر اور ادب کے ساتھ ساتھ یہاں کے کھانے میں بھی مزا ملتا ہے۔ حالانکہ وہ ان کو کھاتے وقت بالکل بدحواس ہو جاتا ہے آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا ہے مگر وہ

ان کھانوں کو نہیں چھوڑتا۔ شامی کباب۔ پھلیاں اور خوب مرچوں والا سالن اس کے پسندیدہ کھانے تھے۔

ناول کے آخری حصے میں وہ ایک محبت کرنے والا شوہر بن کر ابھرتا ہے مگر اس کو یہاں کامیابی نہ مل سکی۔ اسے شمن سے شدید محبت تھی وہ سماج سے دنیا والوں سے اس کی خاطر لڑنے کو تیار ہے۔ اسے دنیا والوں کی فکر نہیں جبکہ شمن بے میل شادی سے گھبراتی ہے اور ناکامیاب ہونے کے ڈر سے انکار بھی کرتی ہے مگر ٹیلر ساری دنیا سے لڑنے کو تیار ہے۔ اسے شمن کے سفید دانت، لمبے بال اور کالی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ وہ اسے بار بار بندی لگانے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ شمن کی طرح طرح سے دلجوئی کرتا ہے۔ وہ شمن کی خوشی کی خاطر ہندی فلم دیکھتا ہے جبکہ اسے ساری فلمیں ایک جیسی ہی معلوم ہوتیں ہیں۔ شادی سے پہلے اسے گھومنے پھرنے، ہوٹلوں میں کھانا کھانے کا بہت شوق تھا مگر شادی کے بعد وہ صرف شمن کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش رکھتا ہے۔

> "نہیں ...... بس یہیں تمہارے پاس ..... وہ اس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا پورا مہینہ چٹکیوں میں سوتے جاگتے ہنستے بولتے گزر گیا"[1]

> "تمہاری محبت کی خاطر سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر ـــــ"[2]

ٹیلر کی اکثر شمن سے لڑائی ہوتی اور دونوں میں بات چیت بند ہو جاتی اور دونوں اکثر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوتے تب تھک ہار کر ٹیلر شمن سے صلح کر لیتا اور الزام خود اپنے اوپر لے لیتا اپنے آپ کو خوب برا بھلا کہتا اور شمن سے دوبارہ دوستی کر لیتا۔ یہاں وہ ایک سمجھدار آدمی نظر آتا ہے۔ مگر وہ گرم مزاج آدمی بھی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ ہو جاتا ہے۔ اور ہفتوں شمن سے بات نہیں کرتا۔ اسی غصہ کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

جہاں اس کے کردار میں کئی اچھائیاں ہیں وہیں چند کمزوریاں بھی سب سے پہلی بات تو یہ کہ شمن سے جس قدر شدت سے محبت کرتا ہے اسی شدت سے نفرت بھی اور غصہ بھی کرتا ہے۔

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۳۷

[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۴۲

اگر ٹیلر نے تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیا ہوتا تو اسے گھر چھوڑ کر نہ جانا پڑتا۔ شمن شروع سے ہی شادی کے خلاف تھی مگر ٹیلر اسے اونچ نیچ سمجھا کر شادی کے لئے تیار کر لیتا ہے۔ شروع میں تو وہ ساری دنیا سے لڑنے کو تیار تھا مگر چند ہی ہفتوں میں وہ سماج سے خوف کھانے لگا۔ لوگوں سے ملتے ہوئے کتراتا اور پارٹی میں نہ جاتا۔ وہ ایک جذباتی اور جلد باز نوجوان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ٹیلر حساس طبیعت کا مالک ہے اسے کسی کی بری بات بہت جلد بری لگ جاتی ہے اور اسی جلدی سے وہ خوش بھی ہو جاتا ہے۔ اپنی طبیعت کی جلد بازی کی وجہ سے بعد میں حالات سے سمجھوتہ نہ کر پایا اور گھر بار بیوی، ماں سبھی کو چھوڑ کر میدان جنگ میں چلا گیا۔ اسے سوچنا چاہیئے تھا اسے شمن کو سمجھنا چاہیئے تھا۔ آخر میں اس نے بہت جلد بازی میں اپنی قسمت کا فیصلہ کیا۔ اور یہی اس کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ کسی چیز کو چھوڑنے سے پہلے اس کی اصلاح ضروری ہوتی ہے جو اس نے نہیں کیا۔

شمنؔ کی زندگی کے جس باب کی شروعات ٹیلر کے ساتھ ہوئی تھی وہ ناکامیاب رہی۔ دونوں چند مہینوں کے علاوہ کبھی خوش نہیں رہے۔ ازدواجی زندگی تلخیوں بھری ناکامیاب زندگی کہی جا سکتی ہے۔ جس میں ہمدردانہ فہم کا فقدان اور ناعاقبت اندیشی کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ اور جس کے نتیجے میں اچھی خاصی ازدواجی زندگی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔ مجموعی طور پر مدنی ٹیلر کا کردار ایک جذباتی عاشق کا کردار ہے۔ جو شمنؔ سے محبت کے بعد اس سے شادی کر لینے میں تو کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ناکامیوں کو برداشت کرنے یا ان کا کوئی حل نکالنے کے بجائے "راہ فرار اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

ایلماؔ ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں ایک بائی عورت کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ وہ خوبصورت اور جوان ہے اس کے پاس اپنے خیالات اپنے احساسات ہیں وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور یورپ کے نئے فلسفہ "فری سیکس" "FREE SEX" کو ماننے والی ہے۔ اس کی نظر میں کسی ایک کا ہو کر رہنا عورت کی توہین ہے وہ کئی مردوں سے تعلق بناتی ہے۔ نوکری کرتی ہے۔ مگر آخر تک بےچین رہتی ہے۔ اس کے کردار میں عصمت نے ان لڑکیوں کی تصویر پیش کی ہے ماڈرن بننے کی کوشش تو کرتی ہے اپنے عمل سے بن بھی جاتی ہیں مگر ہندوستانی سماج میں عبرت کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ ایلماؔ کا بےچین کردار ان لاکھوں لڑکیوں کی بولتی تصویر ہے جو یورپ

ایلما

کی اندھی نقل کرتی ہیں مگر سکون نہیں پاتیں۔

ایلما شمن کی سہیلی ہے وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے اور مزاج سے باغی وہ مذہب کا مذاق اڑاتی ہے۔ اسکی نظر میں کرشن، پیغمبر، یسوع مسیح کسی کا کوئی وقعت نہیں ہے۔ کرشن بھگوان کی تصویر اپنے کمرے میں ٹانکتی ہے اور یسوع مسیح کی شان میں گیت گاتی ہے۔ وہ ہر مذہب کا مذاق اڑاتی ہے اسے یہ بھی اعتراض ہے کہ پیغمبر صرف مرد ہی کیوں ہوئے عورت کیوں نہ ہوئی اس کے انہی عجیب وغریب خیالات کی وجہ سے اسے اسکول اور ہاسٹل سے نکالنے کی کئی بار دھمکی بھی دی گئی تھی۔

ایلما "فری سیکس" FREE SEX کو برا نہیں مانتی وہ شادی کے سخت خلاف ہے۔ اسکی نظر میں شادی فضول باتیں ہیں انسان کو چاہیئے کہ جب جس شخص سے چاہے اپنی جسمانی خواہش پوری کرے۔ کالج کے زمانے میں اسکے کئی لڑکے دوست تھے۔ انتبار اور ستیل اسکی اچھی مثال ہیں۔ حالانکہ اسے ستیل سے نفرت تھی مگر پھر بھی جسمانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنے ضمیر کی آواز بھی نہیں سنتی۔ وہ بڑے کھلے انداز میں شمن سے اپنے دوستوں کا ذکر کرتی ہے۔ وہ ایک تیز اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔ اس کی نظر میں کسی لڑکے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس کا کردار ہندی ناول نگار یشپال کے ایک اہم ناول "دادا کامریڈ" نام کی ناول کی ہیروئن کی طرح ہے۔

"یشپال کی ہیروئن کسی ایک کا ہو رہنے کو بندھن یا ڈھکوسلا سمجھتی ہے اسے جو مرد بھی اچھا جچتا ہے اسی پر اپنے دل کا پیار انڈیلنے کو تیار رہتی ہے یعنی اس نے اپنے لاشعور کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اس پر سماج کے کسی دباؤ، کسی پابندی کو تسلیم نہیں کرتی"[۱]

ایلما بھی اس قسم کی لڑکی ہے۔ سماج اور اس کے بنائے قانون اس کے لئے اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ مذہب کی پابند نہیں ہے۔ سماج کی پابندیوں سے وہ بغاوت کرتی ہے۔ مردوں کے بارے میں اس کے کھلے خیالات سے شمن بالکل گھبرا جاتی ہے۔ مردوں کی قسموں

---

[۱] نئے ادب میں عورت   ہنس راج رہبر   ص ۲۰۷

کے بارے میں اس آزاد خیال لڑکی کا خیال کچھ اس طرح ہے ۔

"۔۔۔۔۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا ..... جو ......"

"کیا ۔ آ ؟" شمّن نے ڈر کر پوچھا ۔

جنھیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے، مثلاً جیسے افتخار ہے ۔ اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے پھر بھی وہ بڑا عجیب مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو"[۱]

"لیکن ایک لمبے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی"[۲]

ایلما ایک فلسفی کی طرح ہر بات کو بہت غور اور فکر کے ساتھ دیر تک سوچتی ہے اسکی نظر میں یہ زندگی خدا نے موج مستی کے لئے دی ہے اس لئے انسان کو اپنی خوشی کو زندہ رکھنا چاہئے اور زندگی ہنسی خوشی سے گذارنی چاہیے ۔ مگر اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کے باوجود بھی وہ خوش نہیں بہت مردوں سے اس کے تعلق تھے مگر جب وہ سیتل کے بچے کی ماں بننے والی تھی وہ برداشت نہیں کر پاتی اور بار بار اپنے آپ کو گنہگار تسلیم کرتی ہے ۔

"۔۔۔۔۔ میں نے اپنی روح کو دھوکہ دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا ۔۔۔۔"[۳]

مگر وہ شادی کے لئے تیار نہیں وہ سیتل کو نیچا دکھانے کے لئے اس سے شادی سے صاف انکار کر دیتی ہے مگر مجبوری میں بچہ پیدا کر کے اسے ماں کا پیار بھی نہیں دے پاتی اور تب بھی وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتی ہے کہ کیا یہ بچہ ناجائز صرف اس لئے کہ سماج کی اجازت کے بغیر یہ اس دنیا میں آیا ہے ۔

ایلما کے کردار میں ایک ناکامیاب لڑکی چھپی ہے جس نے کبھی بھی اپنے دماغ سے کام نہیں لیا بلکہ دل کی پکار سن کر دوڑتی رہی مگر آخر میں وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ انسان کی سچی خوشی کسی ایک کا ہونے میں ہی ملتی ہے اور آخر میں وہ پروفیسر کے ساتھ رہنے لگتی ہے ۔

۱۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۳۲ ۔ ۲۳۳

۲۔ " " — " " — ص ۳۲۱

۳۔ " " — " " — ص ۲۳۲

اس کا کردار ارتقائی اور کامیاب ہے۔ اس آزاد خیال لڑکی کا کردار عصمت نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شمن ایلما سے بہت متاثر ہوتی ہے اور اس کی چیلا بن جاتی ہے مگر شمن نے کبھی صرف ایلما کی باتوں یا خیالات کو آنکھ بند کر کے نہیں مانا بلکہ اپنی عقل سے کام لیتی ہے عصمت نے ایلما کا کردار ایک آزاد خیال موڈرن لڑکی کے روپ میں کامیابی سے پیش کیا ہے۔

رسول فاطمہ اور رنجمہ ٹیڑھی لکیر کے ٹیڑھے لیکن عجیب اور اہم کردار ہیں۔ جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ کجروی کی وجہ سے یادگار بن گئیں ہیں۔ ناول ختم کرنے کے بعد بھی رسول فاطمہ اور رنجمہ کے نقش نظروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور ہم انہیں بھول نہیں پاتے۔ رسول فاطمہ شمن کی "روم میٹ" تھی۔ اور جنسی کجروی کی زبردست شکار تھی۔ اس کی شکل صورت عادت سبھی کچھ نہایت گھناؤنی اور بھدی ہے۔ وہ "ہم جنسیت" کی شکار ہے اور شمن سے اس کی تکمیل چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسا گھناؤنا کردار ہے جسے دیکھتے ہی شمن میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کبھی رسول فاطمہ سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ نہ صرف اسکی عادتیں گری ہوئی گھٹیا تھیں بلکہ اس کی شکل بھی۔

"اسکی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چپٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں باریک سیدھی سیدھی تنکو جیسی پلکیں اور کھردرے بھورے رنگ کے پپوٹے ہر وقت ان میں بے کسی غربت اور بے وقوفی جھلکتی رہتی تھی۔" [1]

رسول فاطمہ اس ناول میں ایک تیز ہوا کے جھونکے کی طرح آئی اور گزر گئی مگر اپنی حرکتوں اپنے عمل اپنے مکالموں کی وجہ سے قاری کے ذہن میں رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کردار میں کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر پھر بھی اسکا کردار جاندار اور زندہ ہے۔ شاید محمد احسن فاروقی کی بات کسی حد تک یہاں ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

"۔۔۔ قوت تخلیق رکھنے والے ناول نگار کے کردار چاہے جتنے بھدے

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۸۲

ہوں چاہے جتنے نامکمل ہوں مگر ان میں جان ضرور ہوتی ہے اور وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچ ضرور لیتے ہیں ایک حد تک اس کی قوت بیان، اس کی قوت مکالمہ نگاری اس کی قوت قصہ گوئی کردار کی تخلیق میں مدد دیتی ہے ۔۔" [1]

رسول فاطمہ کا کردار مختصر ہونے کے باوجود ایک خاص وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتا ہے ۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔

بجمہ

بجمہ ایک خوبصورت اور نازک لڑکی ہے جس سے ہاسٹل کی بہت ساری لڑکیاں محبت کرتی ہیں ۔ اس کی نزاکت، نفاست اور خوبصورتی کی وجہ سے ہی شمن جیسی لڑکی بھی اس پر مرنے لگی تھی ۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی کشش ہے اسے دیکھ کر لذت کا احساس ہوتا ہے عصمت چغتائی کے الفاظ میں ۔

"بجمہ بڑی نازک تھی معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں ایک بھی پکی ہڈی نہیں ۔ شمن کا دل اس کو چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا ۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے ۔" [2]

بجمہ کی شاید وہ کشش ہی تھی جس نے اسے بہت ساری لڑکیوں کا چہیتا بنا دیا تھا ۔ نہ صرف سعادت بلکہ شمن بھی اسے جی جان سے چاہنے لگی تھی ۔

بجمہ بھی نفسیاتی مریضہ ہے یہ رسول فاطمہ کی ضد ہے کیونکہ پہلے رسول فاطمہ شمن پر مرا کرتی تھی ۔ اور اس کی قربت کی متلاشی رہتی یہاں شمن بجمہ پر مرنے لگی تھی ۔ اور اس کی قربت پسند کرتی تھی ۔ ناول ختم کرنے کے بعد یہ کردار اپنی خوبصورتی نزاکت اور لذت کی وجہ سے قاری کے ذہن میں رہ جاتا ہے ۔

نوری

نوری شمن کی آپا بی کی بڑی بیٹی تھی اور شمن کی ہم عمر بھی یہ ایک سیدھی لڑکی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے جس نے ہندوستانی عام بچوں کی طرح بچپن میں انگریزی میں ناک،

---

[1] اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر محمد احسن فاروقی — ص ۱۳۲

[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۹۲

آنکھ اور کان کے مطلب بتائے کچھ بڑا ہوتے پر گڑیا گڈے سے کھیلی اور تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ اگر اس کردار کو الگ کر کے دیکھتے ہیں تو اس میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی مگر جب عصمت کی ناول ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمن کے ساتھ اسکا بیان کرتے ہیں تو یہ ایک اہم کردار بن جاتی ہے۔

نوری ایک ایسی کردار ہے جس نے شمن کو نہ صرف موقع بہ موقع نیچا دکھایا بلکہ اس کے اندر احساس کمتری بھی پیدا کر دی شمن کی آپا نے اپنی نوری کو بہتر تعلیم دینے کے لئے شمن کو جگہ جگہ ذلیل کیا اور اس کا حق چھینا۔ شمن کے کردار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نوری کے کردار کا بھی ارتقاء ہوتا ہے۔

نوری کا کردار شمن کی حریف بن کر آتا ہے۔ نوری نے کئی جگہ شمن کو ذلیل کیا اور شمن کا حق چاہے وہ پیار پانے کا ہو یا تحفہ پانے کا ہو اسے چھین لیا۔ شمن کی منجھولی جب شادی ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ گھر آتیں ہیں اس وقت شمن کی گندی حالت کو نوری اس طرح کہتی ہے۔

"گندی ہیں یہ بھنگن کی لونڈیا، نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی"۔[1]

"خالہ جان شمن مہتراتی کی لڑکی ہے یہ انہیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا"۔[2]

اکثر اس نے شمن کا حق بھی چھینا۔ شمن کو چونکہ منجھو بی نے پالا تھا اس لئے شمن کا حق زیادہ تھا مگر اس کی جگہ اکثر نوری نے لے لی اور شمن آنسو بہاتی رہ گئی۔

چونکہ نوری شمن کی ہم عمر تھی اور دوسرے آپا کی بیٹی اور اس پر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ یتیم تھی۔ نوری حالانکہ خود دل کی بری نہیں تھی مگر گھر والوں نے اس کو اچھا ثابت کرنے کے لئے اکثر شمن کو حقیر ثابت کیا۔ ہر بات میں شمن سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

"نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک وہ بھدی۔ نوری

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۲

[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۳

ہنس مکھ، شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز۔ وہ بدمزاج، بدتمیز اور پھوہڑ۔ پڑھنے سے دم چراتی،، ؎۱

کہنا نہیں مانوگی تو شمن کی طرح پھٹکاریں گے سب "
" نہاؤگی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑجائیں گی "
" پڑھ لو نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤگی "
" پھر تم نے شمن کی طرح ضد کی "
" شمن کی طرح جھوٹ بھولنا خوب آتا ہے " ؎۲

نوری عام یتیم بچوں کی طرح والدین اور خاندان کی لاڈلی تھی۔ جیسا کہ عام مسلمانوں یا ہندوستانی گھروں میں ہوتا ہے کہ مہمان کے آتے ہی بچوں سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ نوری نے عام مسلمان خاندان کی بچی کی طرح عمل کیا والدین کے کہنے پر وہ اپنی پڑھائی کے متعلق بتاتی تب یہ ایک عام بچی معلوم ہوتی۔ اس میں تھوڑی سی تیزی اور تھوڑا سا بھولاپن بھی ہے۔ صبح سلام کرنا، دوسروں کے سامنے جائے نماز پر کھڑے ہو کر نمازیوں کی نقل کرنا۔ اور انگریزی میں نظمیں سنانا اسکی تیزی اور بھولے پن کی مثالیں ہیں۔

نوری کا کردار بھی دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حالانکہ خاندان والوں نے نوری کو ہمیشہ شمن سے بہتر اور بلند مقام دیا تھا مگر جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے وہ شمن سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اندر بناوٹ ہے نہ چاپلوسی حالانکہ سبھی شمن کو حقیر سمجھتے تھے مگر اس کے باوجود اس نے شمن سے دوستی کی جو آخر تک قائم رہی۔ دونوں ساتھ ساتھ گڑیا کھیلتی۔ مسجد کے ملا کا تماشہ دیکھتی اور اسکول کے ہاسٹل میں اکثر ساتھ رہتیں۔ ان دونوں میں اکثر لڑائی بھی ہوتی مگر اس کے باوجود دونوں اچھی دوست رہیں۔ بچپن کی یہ دوستی آخر تک قائم رہی اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتیں رہیں۔ نوری کی شادی کے موقع پر جب یہ دونوں بچھڑی ملیں تو

؎۱ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۵
؎۲ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۹

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے لہٰذا لوٹنے
میں رک گئی نوری اندر کمرے میں ماینوں بیٹھی تھی شمن کو دیکھ کر وہ اس
سے لپٹ گئی ...... مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار ابل پڑا بڑی
محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوگئیں اور رات گئے تک
باتیں کرتی رہیں ــــــــ" [1]

نوری نے ایک ہندوستانی لڑکی کی طرح شرافت سے اپنی تعلیم مکمل کی نہ اس نے کبھی
کلاس میں ٹاپ کرنے یا کھیل کود میں حصہ لینے کی فکر کی اور نہ پڑھائی میں کبھی فیل ہوئی اس
نے پڑھائی شروع کی اور سیدھے سادے طریقے سے تعلیم مکمل کرلی۔ اس نے جب بچپن سے
جوانی کی طرف قدم بڑھایا تو خاندانی چچیرے، ممیرے بھائیوں سے ہلکا پھلکا رومان لڑا بیٹھی
حالانکہ ابھی شادی میں کئی برس تھے مگر دن رات وہ رومانی خیالات میں کھوئی رہتی چونکہ
اسکی شادی شمن سے پہلے طے ہوئی تھی لہٰذا ایک بار پھر وہ شمن سے بہتر سمجھی جانے لگی اور اسے
خود بھی اس بات کا بار بار احساس ہوتا۔ اس نے اپنے جہیز کے لئے تیاریاں بھی شروع کردی
تھیں۔ شادی طے ہونے کے بعد اس کے کردار میں یکایک بڑی تبدیلی آگئی۔

" اسے اب احساس بزرگی بھی ہو چلا تھا، اس نے سارا
چلبلاپن بھی چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گھر والیوں کی طرح سنجیدگی
اختیار کرلی۔ وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر خیال کرنے لگی تھی اس کا مول
اتنی جلدی ہو گیا" [2]

نوری اپنے اندر ایک رومان بھرا دل رکھتی ہے اسے شادی کا بچپن سے ہی
شوق رہا تھا۔ پھر جب اس کی شادی طے ہو گئی تو اس کا سارا وقت اپنے ہونے والے شوہر
کے بارے میں انکی عادتوں کے بارے میں سوچنے میں کٹنے لگا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر
کے بارے میں کچھ زیادہ ہی "کریزی" تھی۔ اکثر رومانی خیالات میں کھوئی ہوئی رومانی باتیں کیا

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۳۸
[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۱۱

کرتی ہے۔

نوری کا کردار اس کی شادی کے ساتھ اس ناول سے ختم ہو جاتا ہے۔ نوری متوسط طبقے کے عام مسلمانوں کے خاندان کی ایک لڑکی کے روپ میں آتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کردار میں زیادہ انفرادیت نہیں ہے لیکن ارتقا ملتا ہے جو ایک اچھے کردار کی خوبی بھی ہے۔

بلقیس

بلقیس بھی ٹیڑھی لکیر میں ایک اہم کردار بن کر ابھرتی ہے۔ یہ شمن کی اسکول کی سہیلی ہے جو بعد میں اس کی روم میٹ بن جاتی ہے۔ اس کا کردار ایک صاف دل، منہ پھٹ، تعلیم یافتہ اور رومانی لڑکی کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے، حالانکہ وہ شمن کی ہم عمر ہے اور اسی کے ساتھ پڑھتی بھی ہے، مگر اسکی معلومات اس دنیا کے بارے میں شمن سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک چالاک اور مطلب پرست لڑکی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس مسلم اسکول میں شمن تعلیم حاصل کر رہی تھی وہاں پر باقاعدہ "مرتے والیوں" کے نام سے ایک لمبا چوڑا گروپ تھا اس گروپ کی لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے پر مرا کرتیں تھیں۔ مگر اس لمبے چوڑے اسکول کی ہزاروں لڑکیوں میں سے دوسری بلقیس ایسی لڑکی تھی جو شمن پر مرتی تھی۔

حالانکہ شروع میں بلقیس بھی لڑکیوں پر مرا کرتی تھی مگر جلدی ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ محبت کرنے کے لئے لڑکے زیادہ مناسب ہوتے ہیں وہ ایک رومانی لڑکی تھی مگر اس سے زیادہ عملی بھی، اس کے عاشقوں کی لمبی چوڑی تعداد ہے مگر لڑکوں سے شادی اور محبت اس بارے میں وہ اکثر بڑے فلسفیانہ انداز میں شمن سے باتیں کرتی۔

لڑکوں سے محبت کے نام پر تحفے وصول کرنا اور اس سے اپنے ناز نخرے پورے کروانا خوب آتا ہے۔ شمن کو اکثر وہ لڑکوں کے بارے میں طرح طرح کی نئی نئی باتیں بتاتی اس سے اس کی رومانی طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ان سارے حربوں سے پوری طرح واقف تھی جس کے ذریعہ کسی کو محبت کے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔

بلقیس لڑکوں سے بہت زیادہ گھل مل جاتی ہے۔ وہ ایک رومانی پسند لڑکی ہے اس کا عشق سب کے سامنے چلتا۔ نہایت بے تکلف انداز میں لڑکوں سے پیش آتی اور ایک ساتھ کئی کئی لڑکوں سے عشق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جسمانی چھیڑ چھاڑ اس کی نظر

کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ عشق کو چھپانے کا قائل نہیں ہے بلکہ گھنٹوں بستر پر لیٹ کر دوسروں سے اپنے عشق کا بیان بڑی بے باکی سے کرتی ہے۔

بلقیس نہ صرف شمن کو چاہتی تھی بلکہ اس کی اچھی دوست بھی تھی۔ وہ شمن کے دل کا حال پوچھتی اور اپنا اسے بتاتی۔ وہ صاف دل کی لڑکی ہے اور اپنی دوست سے کسی قسم کا کوئی پردہ نہیں رکھتی دونوں گھنٹوں بستر میں اور سر جوڑے باتیں کرتی رہتی ہیں۔

بلقیس اس ناول کا واحد کردار ہے جسے آج کل کی فلمی ہیروئن کی طرح کپڑوں سے بالکل لگاؤ نہیں ہے وہ کم سے کم کپڑے پہن کر بڑے آرام سے لڑکوں سے باتیں کرتی ان سے مذاق کرتی۔ اس کی آنکھوں میں شرم نام کی نہیں۔ وہ بے انتہا بے شرمی سے دوسروں کے سامنے بیٹھی رہتی۔ لڑکیوں کے سامنے برہنہ رہنے میں اسے کوئی حرج نظر نہ آتا۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم لڑکیوں سے کیا شرمانا۔ شرم و حیا جو عورت کا زیور ہوتا ہے بلقیس اس سے محروم ہے۔ اس پر کسی کی باتوں کا نصیحت کا بہت کم اثر ہوتا اور وہ اکثر باتوں کو ایک کان سے سن دوسرے کان سے نکال دیتی

"گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اتار دیتی تھی۔ نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر چونٹیوں اور مچھروں کے کاٹے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی ...... اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی ...... نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دبک جاتی جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے روئیں سونے کے تاروں کی طرح چمک اٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی۔"[۱]

صرف بلقیس لڑکیوں سے ہی بے تکلف نہیں تھی بلکہ بلقیس سمیت ساری بہنیں لڑکوں کے سامنے کم سے کم کپڑوں میں جاتیں اور اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دیتی۔ لڑکوں سے بے تکلفی اس حد تک تھی کہ سب کے سامنے عشق ہوتا اور سبھی مجموعی طور پر اس سے لطف اٹھاتے۔

۱؎ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۱۶

ٹیڑھی لکیر کا یہ کردار نہ صرف ناول کو آگے بڑھانے میں تعاون کرتا ہے بلکہ ناول کی ہیروئن شمن کے کردار پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور زندگی کے ایک ایسے پہلو کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتا ہے جس سے شمن ابھی تک ناآشنا تھی۔

قادر عرف کدن ایک چھوٹا سا لڑکا ہے نہایت ڈرپوک، بزدل دبّو اور روندو۔ وہ منجھو بی کی ساس کا پوتا ہے۔ اس کا کردار ایک ایسے بچہ کا ہے جس کے والدین نہ ہوں اور دادی اسے دلار میں بگاڑ رہی ہو۔ اسکی عادتیں خراب تھیں اور ساتھ ہی اس کی شکل بھی ناگوار شمن نے اسکو پہلی نظر میں ہی ناپسند کر دیا تھا۔ بات بات پر رونا، دادی اماں کے پیچھے لگے رہنا اور ہر بات میں ضد کرنا اس کی شکل کچھ اس طرح تھی۔

"لال چقندر رنگ اور نیلی نیلی بلّے جیسی آنکھیں، پکّیا گال ۔۔۔" [۱]

کدن نہایت ڈرپوک تھا۔ وہ اپنی دادی کے ساتھ سوتا اور ہر وقت انہی کے ساتھ چپکا رہتا تھا۔ شمن کا خوب رعب مانتا کیوں کہ وہ اسے اکثر مار دیا کرتی تھی۔ دادی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس نے دادی کی ساری عادتیں سیکھ لیں تھیں۔ ان کے ساتھ پان کھاتا چولہے کے پاس گھس کر بیٹھنا۔ ویسی ہی بوڑھوں جیسی باتیں کرنا وغیرہ۔ شروع میں وہ ایک بزدل اور ڈرپوک بچے کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

کدن اپنی دادی کو بہت چاہتا تھا وہ دادی کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا اور غیر محفوظ سا محسوس کرتا۔ اس کے اندر احساس کمتری شدت سے تھی وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا بھی نہیں۔ دادی اماں کا دوڑ دوڑ کر کام کرتا اس کا کھلونا بھی عام بچوں کی طرح نہیں بلکہ "سروتا" قسم کی چیزیں ہوتیں جس سے وہ گھنٹوں کھیلا کرتا۔

کدن ایک چغلخور بچے کے روپ میں بھی نظر آتا ہے وہ ہر بات دادی سے پوچھ کر کرتا ہے اور ادھر ادھر کی سنی باتوں کو فوراً جا کر دادی سے کہہ دیتا ہے۔ بات بات میں ڈر جانا سب کی ڈانٹ سن لینا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کے علاوہ اس کا کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ حالانکہ یہ کردار بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر اس کی وجہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ شمن جو

---

[۱] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۸۰

جو اس ناول کی ہیروئن ہے کس طرح کے بچوں کو پسند کرتی ہے۔ اور کیوں۔ اسے بزدل، دبو اور ڈرپوک بچوں سے نفرت سی تھی اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے کبھی ڈرنا اور بزدلی سیکھی ہی نہیں تھی۔

اعجاز عرف اجو قادر عرف کدن سے ملتا جلتا ہی ایک کردار اور بھی اس ناول میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے اعجاز عرف اجو۔ اجو شمن کی بیوہ خالہ کا لڑکا ہے چونکہ خالہ نے دوسری شادی کر لی تھی اس لئے اجو شمن کے گھر رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگیا تھا۔ اس کے کردار کے دو پہلو ہیں جس طرح عام زندگی میں کوئی شخص ڈبل کیریکٹر کا ہوتا ہے اسی طرح اعجاز بھی دوہری شخصیت کا مالک ہے چونکہ والدین سے الگ یہ شمن کے بھرے پورے گھر میں رہتا ہے۔ اس لئے یہ بچپن میں احساس کمتری کا زبردست شکار ہے۔ مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اس کے کردار میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک خود مختار خود کفیل مکمل انسان بنکر سامنے آتا ہے۔

اجو کی شکل مکروہ اور گھناونی اور عجیب و غریب قسم کی تھی جسے دیکھ کر وحشت ہوتی اس کی آنکھوں میں ندیدا پن ہوتا اور اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ دوسروں کو بیٹھا گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے گورے چہرے پر سنہرے بال نہایت حقیر معلوم ہوتے اجو نہ کسی سے زیادہ بات کرتا تھا اور نہ اسے کھیلنے سے دلچسپی تھی وہ زیادہ تر کھانے پینے کے بارے میں سوچتا اجو کی آنکھیں گول گول بات کرنے والوں کا ہونٹ تکا کرتیں تھیں۔

اجو کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ جنم جنم سے بھوکا ہے۔ دستر خوان پر سب سے پہلے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور سب سے آخر میں کھا کے اٹھتا۔ اس کی بھوک کی انتہا تو تب ہوتی ہے جب دوسروں کا بچا ہوا کھانا۔ آم کی چوسی ہوئی گٹھلیاں، کھائی اور چبائی ہوئی ہڈی تک وہ کھا جاتا مگر پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا اور تب وہ کتے کا راتب اور مرغی کو ڈالنے والے داتوں میں بھی اپنا حصہ بنا لیا کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب کی پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے کا بڑا لقمہ بنا کر رکھ لیتا اور دیر تک مزا لے کر کھایا کرتا گھر کے سبھی لوگ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے۔ بچے ہوئے چاول اور دودھ، چسی ہوئی ہڈی اور آم کی گٹھلی کی لالچ دیکر کوئی بھی شخص اس سے کام کروا سکتا تھا اس طرح وہ ایک ندیدہ بھوکا اور نیت جلا بچے کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں لذت اور مزے کی اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی کھانا جیسا بھی باسی ہو یا تازہ

جو اس ناول کی ہیروئن ہے کس طرح کے بچوں کو پسند کرتی ہے۔ اور کیوں۔ اسے بزدل، دبو اور ڈرپوک بچوں سے نفرت سی تھی اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے کبھی ڈرنا اور بزدلی سیکھی ہی نہیں تھی۔

اعجاز عرف اجو قادر عرف کدن سے ملتا جلتا ہی ایک کردار اور بھی اس ناول میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے اعجاز عرف اجو۔ اجو شمن کی بیوہ خالہ کا لڑکا ہے چونکہ خالہ نے دوسری شادی کر لی تھی اس لئے اجو شمن کے گھر رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگیا تھا۔ اس کے کردار کے دو پہلو ہیں جس طرح عام زندگی میں کوئی شخص ڈبل کیریکٹر کا ہوتا ہے اسی طرح اعجاز بھی دوہری شخصیت کا مالک ہے چونکہ والدین سے الگ یہ شمن کے بھرے پورے گھر میں رہتا ہے۔ اس لئے یہ بچپن میں احساس کمتری کا زبردست شکار ہے۔ مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اس کے کردار میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک خود مختار خود کفیل مکمل انسان بنکر سامنے آتا ہے۔

اجو کی شکل مکروہ اور گھناونی اور عجیب و غریب قسم کی تھی جسے دیکھ کر وحشت ہوتی اس کی آنکھوں میں ندیدا پن ہوتا اور اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ دوسروں کو بیٹھا گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے گورے چہرے پر سنہرے بال نہایت حقیر معلوم ہوتے اجو نہ کسی سے زیادہ بات کرتا تھا اور نہ اسے کھیلنے سے دلچسپی تھی وہ زیادہ تر کھانے پینے کے بارے میں سوچتا اجو کی آنکھیں گول گول بات کرتے والوں کا ہونٹ تکا کرتیں تھیں۔

اجو کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ جنم جنم سے بھوکا ہے۔ دستر خوان پر سب سے پہلے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور سب سے آخر میں کھا کے اٹھتا۔ اس کی بھوک کی انتہا تو تب ہوتی ہے جب دوسروں کا بچا ہوا کھانا۔ آم کی چوسی ہوئی گٹھلیاں، کھائی اور چبائی ہوئی ہڈی تک وہ کھا جاتا مگر پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا اور تب وہ کتے کا راتب اور مرغی کو ڈالنے والے دانوں میں بھی اپنا حصہ بنا لیا کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب کی پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے کا بڑا لقمہ بنا کر رکھ لیتا اور دیر تک مزالے کر کھایا کرتا گھر کے سبھی لوگ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے۔ بچے ہوئے چاول اور دودھ چسی ہوئی ہڈی اور آم کی گٹھلی کی لالچ دیکر کوئی بھی شخص اس سے کام کروا سکتا تھا اس طرح وہ ایک ندیدہ بھوکا اور نیت جلا بچے کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں لذت اور مزے کی اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی کھانا جیسا بھی باسی ہو یا تازہ

بات بات پر لوگ اسکو مارتے اور مذاق اڑاتے اور اب
"۔۔۔۔ اعجاز بالکل نیا چولا بدل کر آیا تھا وہ جھینپ اور چھچھورا پن تو کوئی اس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت چرب زبان ہنس مکھ اور دلیر لہ"

اجو اور کدن دو کردار اس ناول کے ایسے ہیں جن سے ہمیں شمن کی خطرت اور پسند ناپسند کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ڈرپوک۔ بزدل اور کمزور اور ظلم سہنے والوں کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ دونوں ہی کردار اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور کامیاب ہیں۔

ٹیڑھی لکیر میں ایک ماں کا خوبصورت کردار عصمت نے بڑی خاموشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ماں شمن کی نہیں بلکہ اس کے شوہر ٹیلر کی ماں ہیں۔ جو ہندستان سے کوسوں دور بیٹھی صرف خط کے ذریعہ اپنے بیٹے اور بہو کو پیار بھیجتی ہے۔ اس نے اپنے پیارے اور اکلوتے بیٹے کو جنگ کے لئے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ یہ ماں ہندوستان کی لاکھوں کروڑوں ماؤں کا ایک اچھا نمونہ بھی ہیں۔ جس میں اپنے بیٹے اور ان دیکھی بہو کے لئے ممتا ہے۔

جب وہ سنتی ہیں کہ اس کے بیٹے نے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی ہے تو بجائے خفا ہونے کے وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اپنا قیمتی زیور بھی شمن کو بھیجتی ہیں۔ وہ ہزاروں ہدایت اپنی بہو کو دیتی ہے کہ وہ اس کے بیٹے کو کس طرح سنبھالے۔

اور ایک شمن کی لاپرواہ ماں کا کردار ہے۔ یہ دونوں کردار آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک ماں کے اندر ممتا کا ساگر ہے تو دوسرے میں پیار کا چٹیل میدان۔ ایک ہزاروں میل دور بیٹھی بھی اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے۔ دوسری صرف بچوں کی تعداد بڑھانے میں لگی ہے۔ اسے فکر ہی نہیں ہے کہ جو بچے اس نے پیدا کئے ہیں وہ پل بھی رہے ہیں یا مر گئے۔

ناول میں شمن کی ماں ایک لاپرواہ اور بے حس ماں کے روپ میں ابھرتی ہے وہیں ٹیلر کی ماں مغربی ہوتے ہوئے بھی ایک خالص مشرقی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے جسے "مثالی" بھی کہا جا سکتا ہے۔

لہ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۱۲

عورت اور مرد کرداروں میں تفریق اور بغاوت

عصمت کے اس ناول میں کردار نگاری جاندار اور ارتقائی ہے۔ چونکہ کردار مختلف ہیں اس لئے نہ صرف انکے خاندان۔ طبقے۔ مزاج، مذہب۔ رہن سہن ان سبھی کے بارے میں اچھی جانکاری بھی ملتی ہے۔ ان کے مرد اور عورت کرداروں میں عورت کا کردار زیادہ واضح اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے جذبات کا بیان عصمت بخوبی کر پاتیں ہیں ان کے جذبات احساسات۔ اچھائی برائی۔ بغاوت نفرت کو عصمت اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور قلم سے بیان کرتیں ہیں۔ عورت کرداروں کے مقابلہ میں مرد کردار عموماً کمزور اور ناکامیاب ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی عصمت کرتیں ہیں۔ مگر گہرائی تک نہیں پہونچ پاتیں ایک خاص وجہ ان کا عورت ہونا بھی ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر ان کے کردار عجیب وغریب انفرادی اور ارتقائی ہوتیں ہیں زیادہ تر "ROUND" کردار پیش کرتیں ہیں جو ماحول کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ جامد کردار ان کے ناولوں میں نہ کے برابر ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ عصمت کی ناولیں کردار نگاری کے لحاظ سے کافی مقبول بھی رہیں ہیں اور کامیاب بھی۔

"ٹیڑھی لکیر" کے کرداروں میں ہمیں انسانی سماج کے ایسے چہرے نظر آتے ہیں جو ہمارے جانے پہچانے چہرے تو ہیں لیکن ہم نے انہیں کبھی بغور دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ان چہروں سے ان کے ذہن و دل کے نہاں خانوں میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔ عصمت چغتائی نے ان کرداروں کے ذریعہ اپنے ارد گرد کی زندگی کو اس کی خوبیوں خامیوں، سچائیوں اور مثبت و منفی پہلوؤں کے ساتھ اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کرداروں کے ذریعہ مذہب، سماج، اخلاق، سیاست، اقتصادیات، اور محبت اور انسانی نفسیات اور ذہنی اور جنسی کجروی سبھی کو ان کے صحیح سیاق و سباق میں ایک سچے اور ایماندار ناول نگار کی طرح پیش کر دیا ہے۔ اس طور پر یہ کردار ہمارے عہد کے سماج کا ایک زندہ دستاویز بن گئے ہیں۔

ٹیڑھی لکیر میں بعض نفسیاتی الجھنیں

"ٹیڑھی لکیر" کے سلسلے میں عصمت چغتائی نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے ٹیڑھی لکیر میں فرائڈ کے بدنام زمانہ اصولوں سے انحراف کر کے فرد کے ماحولیاتی اثرات پر زیادہ زور دیا ہے۔ عصمت نے ایک روسی خاتون کے نام خط میں لکھا ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" میں نے عام زندگی سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس کے تمام کردار زندہ ہیں، اپنے اور اپنے دوستوں کے خاندان میں۔ میں نے سائیکالوجی پر بہت سی کتابیں پڑھیں ان سے میں نے شمن کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت مدد ضرور لی۔ مگر فرائڈ کے اصول کے بالکل الٹ لکھا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ہمارا ہر فعل جنسی تحریک سے ہوتا ہے مگر میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جنس اپنی جگہ ہے مگر ماحول کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر قمر رئیس نے عصمت کے اس دعویٰ کو صحیح مانتے ہوئے لکھا ہے کہ

"عصمت کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ "ضدی" اور "ٹیڑھی لکیر" دونوں کے کرداروں کا مطالعہ اسی توازن نقطۂ نظر کا ثبوت ہے —"[۲]

بہتر ہو گا کہ عصمت چغتائی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے دعووں پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم فرائڈ کے نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔

ذہن کی ساخت کے بارے میں فرائڈ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہر شعوری فعل کی تہہ میں لاشعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہ لاشعور جبلّی زندگی کا سرچشمہ اور نسلی ورثہ کا گودام ہے۔ اس گودام میں تمام وہ جذباتی تجربے جمع رہتے ہیں۔ جن کا تعلق بچپن کی زندگی سے ہے۔ اور جن کا موضوع جنسیات ہے۔ یہ جذبات دراصل ان ہیجانوں، تمنّاؤں اور خواہشوں کے

---

[۱] تلاش توازن۔ قمر رئیس ص ۴۴
[۲] ایضاً " ص ۴۴

مظہر ہیں جو شعوری زندگی کے معیار سے ٹکراتے ہیں اور اس ڈر کی وجہ سے کھلّم کھلا ظاہر نہیں کیے جا سکتے۔ ______ "۔[1]

فرائڈ جنسیات کو زندگی کا سنگ بنیاد اور سب سے بڑا محرک سمجھتا ہے اس کے نزدیک جنسی نشوو نما کی تین منزلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک منزل پر انسان مختلف قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے پہلی منزل نرگسیت یا خود فریفتگی (NARLESSISM) کی ہے۔ جو پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک رہتی ہے اس وقت بچہ خود اپنی ذات پر عاشق ہوتا ہے لیکن اس کیساتھ وہ ایڈیپس گرہ OEDEPUS COMPLEX میں گرفتار ہو جاتا ہے یعنی لڑکے میں باپ کے خلاف جذبۂ رقابت پیدا ہوتا ہے کہ اس کے جنسی ہیجانات کی تشفی کا ذریعہ اس کی ماں ہے جس پر اس کا باپ حاوی ہے لڑکی کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ شروع میں اس کی جنسی قوت کا مرجعہ ماں ہی ہوتی ہے لیکن جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ لڑکوں کی بہ نسبت اس میں ایک جسمانی کمی ہے تو وہ ماں کو اس کی کمی کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔ اس ذہنی الجھن کو فرائڈ "گرہ آفتگی" سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن یہ کمی لڑکی کو اپنے باپ کی ذات سے پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ فرائڈ کے خیال میں لڑکی کافی عرصہ تک اس الجھن میں مبتلا رہتی ہے اور یہی کچھ عورت کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔

فرائڈ انسانی شخصیت کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کے مطابق اسرار اور ابہام سے پرے شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- ID - اڈ
2- Ego ایگو
3- Super Ego فوق انا

اس کے نزدیک اِڈ ان تجربوں اور آرزوؤں پر مشتمل ہے جو سماجی لحاظ سے ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور انہیں وحشیانہ اور غیر مہذب سمجھنا چاہیئے۔ "انا" کا تعلق مہذّب سماجی زندگی سے ہے یہ سماجی زندگی بظاہر ناخوش گوار حقیقتوں کو قبول کرتی ہے۔ اور شعوری

---

[1] تحلیل نفسی کے پیچ و خم ڈاکٹر سلامت اللہ ص ۹

عمل کو تہذیب کے معیار پر پہنچاتی ہے۔ "فوق انا" شخصیت کا وہ جزو ہے، جو حاکم کی حیثیت رکھتا ہے اور "انا" کو "اڈ" کے وحشیانہ رجحانات کو دبانے کی ترغیب دیتا ہے" انا" زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جنم لیتی ہے، جب کہ بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک مضبوط جذباتی رشتہ قائم ہوتا ہے لیکن اس وقت انا چونکہ بہت کمزور ہوتی ہے، اس لئے اڈ کی نامعقول شورشوں کو دبا کر رکھنے میں اُسے والدین کے اقتدار سے مدد لینی پڑتی ہے والدین ایک سخت گیر آقا کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ بچپن کی ناجائز خواہشات کو جبر و تشدد سے دبا دیتے ہیں۔ شخصیت کا وہ حصہ جو اس طرح والدین کی طاقت اور اقتدار کو ظاہر کرتا ہے فوق انا کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اور آگے چل کر اس میں وہ تمام سماجی قوتیں مرکوز ہو جاتی ہیں جو سماجی قوانین اور طور وطریقہ کی ضامن ہیں۔ گویا فوق انا سماج کی نمائندگی کرتا ہے اور اڈ فرد کی نمائندہ ہے۔ اور خود انا پولیس مین کے فرائض انجام دیتی ہے، کہ اس کا کام فرد سے سماج کے قوانین اور احکام کی تعمیل کرانا ہے۔ ــــــ" [۱]

فرائڈ کے اس نظریہ کے مطابق اِڈ اور انا کے درمیان مستقل رسہ کشی ہوتی رہتی ہے۔ جب اڈ اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی تو فرد مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ فرائڈ کی نفسیات میں ان کی ماہیت کو سمجھنا اور حل معلوم کرنا تحلیل نفسی کہلاتا ہے۔

"ذہنی امراض کے اسباب کا پتا لگانے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ہم فرد کے شعور کا جائزہ لیں یا اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں سرچ لائٹ ڈال کر دیکھیں کہ وہاں کیا کچھ کثافت اور گندگی پڑی ہے۔ ہمیں ان امراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس سماج کی ساخت اور تنظیم کا تجزیہ کرنا ہوگا جس میں یہ رونما ہوتے ہیں۔ [۲]

اسی طرح تحلیل نفسی کے مشہور ماہر ایڈلر نے جو فرائڈ کے شاگرد ہیں، ذہنی بیماریوں کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے

۱۔ تحلیل نفسی کے پیچ و خم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ص ۱۲
۲۔ تحلیل نفسی کے پیچ و خم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ص ۱۸

"ایک ایسے تمدن میں جہاں آدمی آدمی کا دشمن ہو ہمارے صنعتی نظام کا لب و لباب یہی ہے ـــــ بد اطواری ختم نہیں کی جا سکتی کیونکہ بد اطواری اور جرم ہمارے صنعتی تمدن میں زندگی کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ [1]"

عصمت چغتائی کے شاہکار "ٹیڑھی لکیر" کا ہر کردار ہمیں نفسیاتی الجھنوں کا شکار نظر آتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں نوبل پرائز کمیٹی کے بعض ممبران کا وہ اعتراض یاد آتا ہے جو انہوں نے ارنیسٹ ہیمنگوے کے ناولوں پر کیا تھا۔

ان کی افسانوی دنیا میں نہ صرف عورتوں کے بغیر مرد ہیں (عورتوں کے بغیر مرد ان کے افسانوں کے ایک مجموعے کا بھی نام ہے) بلکہ بغیر روزگار کے مرد ہیں۔ بغیر والدین یا بچوں کے مرد ہیں یا بغیر گھر بار اور طبقے کے مرد ہیں ـــــ" [2]

یعنی اس کے تمام کردار ادھورے سے نظر آتے ہیں مرد بغیر روزگار کے جنہیں عورتوں کی قربت حاصل نہیں ہے۔ عورتیں ہیں تو انہیں مردوں کا سہارا نصیب نہیں ہے۔ بچوں میں عدم تحفظ کا احساس بہت نمایاں ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں بھی ہر کردار نامکمل اور نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔ عصمت نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ٹیڑھی لکیر کو لکھنے سے پہلے انہوں نے علم نفسیات پر بہت سی کتابیں پڑھیں تھیں تب کہیں جاکر شمن کے کردار کی تخلیق کی مگر جہاں تک اس ناول کے بارے میں میرا خیال ہے عصمت نے جہاں علم نفسیات کی کتابیں پڑھیں وہیں نفسیاتی بیماریوں کا بھی اچھا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے اور مشاہدے سے ایک ایک بات کو نہایت سلیقے کے ساتھ ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں سمو کر پیش کر دیا۔ یہ عصمت کا ہی قلم تھا۔ جو ٹیڑھی لکیر کے ہر کردار میں ایک بیماری کو بخوبی پرو کر اور کچھ میں ایک سے زیادہ بیماریوں کو پیش کیا ہے۔ عصمت نے اس ناول میں جتنے بھی کردار پیش کئے ہیں ان میں نفسیاتی عوارض بھی پیش کئے ہیں اور وجوہات بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کہیں ایسا بھی لگتا ہے کہ عصمت بیماری کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتی ہیں اور بیماری کو اچھے بھلے انسان میں

---

[1] تحلیل نفسی کے پیچ و خم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ص 19

[2] ارنیسٹ ہیمنگوئے — سلامت اللہ خاں — ص 11

ٹھونس دیا ہے۔

بچوں میں، خاص طور سے لڑکیوں میں تحفظ کا احساس باپ کی طرف سے ورثہ میں ملتا ہے عموماً لڑکیوں میں آئیڈیل مردان کا باپ ہوتا ہے۔ فرائڈ اسے "ایڈیپس کامپلیکس" کہتا ہے۔ لیکن شمن کے والد ایک غیر فطری سا کردار ہیں، جس کو دس بچوں اور ایک جوان بیٹی کے بیوہ ہونے کے بعد بھی بچوں سے زیادہ اپنی بیوی کی ضرورت تھی شمن کے ماں اور باپ کے پلنگوں کی پٹی سے پٹی جڑی رہتی تھی۔ جس کے نتیجے میں شمن کے کردار میں ایک کجی سی آجاتی ہے۔ خواہ اس کی وجہ ماں باپ کے پیار سے محرومی ہو یا گرم گرم انا کے لمس کی جگہ دودھ کی بوتل کا آنا۔

بنیادی طور سے انسان دوسرے انسان سے لمس و لذت کا طلب گار رہتا ہے شمن اس لذت سے شروع سے ہی محروم رہی۔ پہلے والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے اور پھر انا کے بچھڑ جانے کی وجہ سے اس کے بعد شمن کو ایک زبردست دھچکا منجھو بی کی شادی پر لگتا ہے۔ کچی عمر کے پے در پے دھچکے شمن کے مزاج کی کجی کو جنسی کجروی میں بدل دیتے ہیں۔

عصمت نے اپنے اس بلند بانگ دعوے کے باوجود کہ وہ ماہر نفسیات فرائڈ وغیرہ کے فلسفہ سے قطعی متضاد نتائج برآمد ہونے والا ناول لکھ رہی ہیں وہ ٹیڑھی لکیر میں ہر مقام پر فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کے نظریات سے اتفاق کرتی نظر آتی ہیں۔ یونگ کا نظریہ "ہم جنسیت"، عصمت چغتائی کا پسندیدہ موضوع ہے ان کے افسانوں (لحاف وغیرہ) میں جا بجا ان کے کردار اس علت کا شکار نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر میں یہ مرض اپنے عروج پر ہے اور متعدی بیماری کی طرح ایک کردار سے دوسرے کردار میں لگتا ہے نہ جانے کون سا کالج ہے جس کے زیادہ تر نسوانی کردار اس بیماری میں غوطے لگاتے ہیں وہاں لڑکیاں نہ صرف اپنی معشوق لڑکیوں کو کھلے عام تحفے تحائف دیتی ہیں جسمانی محبت کرتی ہیں بلکہ باقاعدہ لڑکیوں کا ایک طبقہ "مرنے والیوں" کے نام سے مشہور ہے۔[۶]

رسول فاطمہ LESBIANISM کی زبردست شکار ہے یہ شمن کی روم میٹ

تھی حالانکہ ہاسٹل میں لڑکیوں کو ساتھ سونے کی ممانعت تھی مگر رسول فاطمہ چاہتی تھی کہ وہ شمن کے ساتھ سوئے۔ ہزار بار شمن نے اس کو ڈھکیلا مگر وہ اپنا پلنگ شمن کے پاس کر کے ہی سوتی۔ ایسا نہیں کہ صرف بڑی لڑکیاں ہی ایسی غلاظت میں لوٹا کرتی تھیں بلکہ ہاسٹل کی چھوٹی لڑکیاں بھی اس طرح کے بے ہودہ کھیل کھیلتی ہوتی پکڑی گئی تھیں۔

شمن کسی طرح رسول فاطمہ سے اپنی جان بچا کر اپنی دوست سعادت کے کمرے میں آجاتی ہے اُسے امید تھی سعادت بہت خوش ہو گی مگر سعادت کا رویہ اس کے برخلاف رہا۔ وہ شمن کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں سعادت اور نجمہ بھی اسی بیماری کی شکار تھیں یوں تو شمن کو سعادت اور نجمہ کی باتیں عجیب لگتیں اور جب ایک روز اس نے غور سے نجمہ کو دیکھا تو وہ پگھل ہی تو گئی۔ نجمہ کا ذکر کرنے میں عصمت نے خود بھی کم مزے نہیں لئے ہیں جگہ جگہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔ نجمہ کے ذکر کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا عصمت بھی عورت کے حسن میں دلچسپی لیتی رہی ہیں۔

> "ایک دن یونہی وہ شمن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمن پریشان ہو گئی اور جب اس نے اپنے دوپٹے کا آنچل جھٹکا تو وہ شمن کے بازو پر آن گرا، شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا ہو۔ وہ سُن بیٹھی رہی ——— "[1]

جنسی جذبات کس طرح دھیرے دھیرے بڑھتے ہیں عصمت نے بہت خوبصورتی سے اور الفاظ تول کر بیان کیا ہے۔ شمن بھی انجانے میں اس غلاظت کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس بات کا اس کو احساس بھی نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود اسے نجمہ سے محبت اور سعادت سے نفرت ہونے لگی۔ کیونکہ سعادت جان بوجھ کر نجمہ کو شمن سے دور رکھتی تھی جس پر اسے بہت غصہ آتا۔ اور اب شمن بالکل عاشقوں کی طرح نجمہ کے کپڑے اس کا رنگ دیکھتی بکھرے ہوئے بال دیکھتی۔ اس کے کرتے کو جسم سے چپکا ہوا محسوس کرتی چونکہ سعادت نجمہ کو

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۹۲-۹۳

چاہتی تھی اس لئے شمن سعادت کو اپنا رقیب محسوس کرتی ہے۔
شمن پر رسول فاطمہ مرا کرتی تھی اور اب شمن خود اس مرض میں مبتلا ہو گئی تھی نجمہ اور سعادت سے لڑائی ہونے پر وہ موقع دیکھ کر نجمہ سے ملنے جایا کرتی چونکہ عشق کے اظہار میں پہل کرنے کی ہمت نہ پڑتی اس لئے دونوں واپس خاموش آجاتی ہیں۔
جب شمن اسکول میں ہیڈ مسٹریس بنی اس وقت بھی اس بیماری سے نجات نہ مل سکی تھی۔ اس کے آس پاس اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے۔
اسی اسکول کی ٹیچرس میں ایک تھیں مس سارکسن یہ اور اس کی ساتھی مسز شرما دونوں ہی آپس میں جنسی تعلقات رکھتی تھیں عصمت نے یہاں انکا ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ زمانہ بدل رہا تھا سماجی حالات میں سدھار ہو رہا تھا اور تعلیم نسواں ترقی پر تھی مگر جنسی کجروی کا کوئی علاج نہ ہو سکا تھا گویا عصمت یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں سدھار تو ہو رہا تھا مگر جنسی بے چینی اور نفسیاتی کمزوری ابھی بھی موجود تھی اس میں کوئی سدھار نہ ہوا تھا ناول کی کہانی جب بڑھتے بڑھتے امریکن اسکول میں پہنچتی ہے تو وہاں بھی ہمیں وہی فضا اور ماحول ملتا ہے۔ ناول کا ہر وہ کردار جس کا ذکر چند صفحات پر مشتمل ہے اس میں کچھ نہ کچھ جنسی کجروی ملتی ہے اسی طرح کا ایک کردار جو نفسیاتی کمزوریوں سے لبریز ہے ایلما۔ یہ شمن پر کافی اثر بھی ڈالتی ہے۔ اسے شادی سے نفرت ہے مگر مردوں سے پیار۔ اسے بچے تو چاہیئے مگر شادی کے بغیر یہ عجیب وغریب کردار ایلما عیسائی ہے مگر اُسے اپنے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ وہ کرشن کی تصویر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھا کرتی تھی۔
یہ لڑکی شروع سے ہر بات میں ABNORMAL نظر آتی ہے۔ یہ منہ پھٹ زبان دراز ہے۔ مذہب سے بیگانہ بھی اور اپنی مرضی سے مذہب کی پابندی بھی کرتی ہے۔ ہر بات کو اپنے نظریئے سے دیکھنا اور اس کا مذاق اڑانا اسے پسند تھا۔ ایلما کو عورت اور مرد کی باتیں زیادہ پسند تھیں۔ اور اسی وجہ سے کئی بار لڑکیوں نے اس کی شکایت پرنسپل سے کر دی تھی اور پرنسپل نے اسے اسکول سے نکال دیئے جانے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی مگر یونیورسٹی میں ایلما اپنی باتوں کی وجہ سے ہی ہر دل عزیز بن گئی تھی لڑکوں کے بارے

میں اس کے خیالات نہایت خطرناک قسم کے تھے۔ وہ اکثر شمن سے ان ہی باتوں کا ذکر کیا کرتی جنہیں شمن پوری طرح سمجھ ہی نہیں پاتی تھی سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنی باتوں کو پوری طرح سمجھنے سے " قاصر تھی۔ اسے سیتل سے نفرت تھی افتخار سے محبت مگر اسے نہ یہ معلوم تھا کہ محبت کیوں ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ نفرت کیوں ہے۔

عام طور پر بن بیاہی ماں بننے کا جب خطرہ ہوتا ہے تو لڑکی سماج اور خاندان کے ڈر سے لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش کرتی ہے مگر یہاں سیتل بار بار شادی پر زور دے رہا ہے اور ایلما اسے نیچا دکھانے کے لئے اس کے بچّے کو گرانے کو تیار ہے۔

یہ کردار نئی اور پرانی روایت کے بیچ کش مکش میں مبتلا دکھائی پڑتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ بغیر شادی کے افتخار کے بچے کی ماں بننے کی خواہش مند ہے۔ اور جب یہ خواہش غیر شعوری طور سے سیتل سے پوری ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ

"جسمانی طور پر تو میں واقعی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے۔ [1]

جب ایلما کے بچے رولف کا انتقال ہو جاتا ہے تو شمن اسے شادی کرنے پر زور دیتی ہے۔ مگر وہ تیار نہیں ہوتی۔

"—— ایلما شادی کر ڈالو" شمن نے سمجھانے کی کوشش کی۔

رولف پیدا کرنے کے لئے۔ تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتی؟ اس لئے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں رولف کے ساتھ پھر ناانصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر میں نے ڈائن کے سے سلوک کئے —— [2]

شمن کی دوست ایلما سیتل سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے بچے کی ماں بنتی ہے وہ کہتی ہے

"تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہوگی مگر میں کہتی ہوں کیوں کہ مجھے سیتل سے نفرت ہے اور اسے مجھ سے۔ ——" [3]

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۶۸
[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۴۶
[3] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۴۷

اس مرض کو نفسیات کی اصطلاح میں

می سوجینی "MISOGANY" کہتے ہیں جس کا مطلب

"HATRED OF MARREIGE" ہے۔ [1]

اس نفسیاتی مرض کے شکار مریض جنسی جذبات تو رکھتے ہیں اور پورا بھی کرتے ہیں مگر شادی نہیں کرتے۔

جس طرح ایلما نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہے اسی طرح اس کا بچہ جو سیتل کی نفرت کا نتیجہ تھا۔ وہ ہمیشہ سیتل کا بدلا اس بچہ سے لیا کرتی۔ ایلما نے کبھی بھی رولف کو اپنے بیٹے کی طرح نہیں چاہا نہ ہی اس کی کوئی خواہش پوری کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچہ بغاوت پر اتر آیا اور ہر بات جو اس کی نہ پوری کی جاتی وہ بغاوت کر کے پوری کرانے کی کوشش کرتا۔

ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اگر بچپن میں بچہ کو اچھا اور پرسکون ماحول نہ ملا تو بچہ بگڑ جاتا ہے۔ بچہ کا ضدی ہونا، بدتمیز ہونا۔ جوش میں آکر بار بار جھنجھلانا اور بات بات پر بغاوت کرنا اس کے ماحول کی خرابی اور انسانی جبلّت کی ناآسودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ماں کی شفقت محبت اور نفرت کا اثر بھی بچہ کی ذہنیت پر پڑتا ہے۔ رولف کا کردار اس کی جیتی جاگتی مثال ہے

اس کے برعکس ٹیڑھی لکیر میں منجھو کی ساس کا پوتا ہمیں ایک دوسری نفسیاتی الجھن کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ دادی کے پیچھے پیچھے ہر وقت گھومتا ہے۔ اس میں محبت کی وجہ سے کئی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ کدّن نہایت ہی ڈرپوک صلح پسند اور سیدھا سادا تھا۔ شمن سے وہ ڈرا کرتا اور ہر وقت دادی کے پاس چپکا رہتا۔ کدّن کو محبت زیادہ ملی تھی تو اس لئے وہ نہایت سیدھا اور شریف تھا اور شمن کو محبت کی کمی نے نہایت ضدی۔ بدمزاج۔ بدتمیز اور لڑاکو بنا دیا تھا۔

زیادہ چاہت ملنے کی وجہ سے اکثر بچے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان میں خود اپنے اوپر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ ماں کا (یہاں دادی کا) اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ چند لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کر پاتا۔

---

[1] ڈکشنری آف سائیکالوجی — جیمس ڈرون — ۶۹

اِس سے بچے خود اعتمادی۔ یقین ہمّت کھو بیٹھتے ہیں اور سائے کی طرح چاہنے والے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کدّن دادی کے بغیر ایک پل بھی رہ نہیں پاتا۔

"کدّن دادی کے ساتھ ساتھ چولہے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا" [۱]

چونکہ کدن کے گھر میں صرف دادی اور چچا تھے اس لئے کدّن کا دادی کی طرف کا جھکاؤ "اُوڈی پس کامپلیکس" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں کدّن بیٹے کی طرح ہے اور ماں کدن کی دادی۔

اسی طرح الیکٹرا کامپلیکس کی مثال بھی بہت واضح ہے اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

ELECTRA COMPLEX :-

"— Attachment of daughter to father, with antagonism towards mother, and more or less a counter- part of the oedipus complex —" [۲]

یہ بھی فرائڈ کا نظریہ ہے اس الجھن کی عموماً وہی لڑکیاں شکار ہوتی ہیں۔ جن کے والد انہیں بہت زیادہ چاہتے ہیں ویسے یہ قدرتی بات بھی ہے کہ بیٹی ہمیشہ ماں سے زیادہ باپ کو چاہتی ہے۔ یہ چاہت ایسے موقع پر اور بڑھ جاتی ہے۔ جب ماں کا یا تو انتقال ہو گیا ہو یا پھر طلاق کے بعد لڑکی والد کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اس ناول کے ایک عجیب وغریب کردار رائے صاحب کی اکلوتی بیٹی پریما "الیکٹرا کامپلیکس" کی اچھی مثال ہے۔ پریما رائے صاحب کی بیٹی اپنے والد سے اس قدر قریب اور بے تکلف ہے کہ حیرت ہوتی ہے ان کی باتیں، ان کی چھیڑ چھاڑ ان کی بے تکلفی اور محبت کرنے کے انداز سے صرف شمن کو ہی حیرت نہیں ہوتی بلکہ قارئین بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ باپ بیٹی کی جسمانی چھیڑ چھاڑ کو دیکھ کر اور ہی گمان ہونے لگتا

۱۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۱

۲۔ ڈکشنری آف سائیکالوجی — جیمس ڈرون — ص ۵۱

ہے لیکن یہ دونوں کردار اس معاملے میں اب نارمل ہیں۔ پریما الیکٹرا کامپلیکس کی ایک اچھی مثال ہے۔

مختلف نفسیاتی بیماریوں میں ایک بیماری ایسی بھی ہوتی ہے جس میں انسان بات بات پر روتا ہے۔ بہت دیر تک منتیں کراتا ہے۔ ایسا شخص خاص طور پر اپنے چاہنے والوں کے سامنے زیادہ روتا ہے چاہے وجہ اہم نہ بھی ہو مگر وہ روئے گا ضرور اسی مرض میں مبتلا ایک کردار مسز سارک ہیں جو نفسیاتی عارضے Epiphora میں مبتلا ہیں۔

Epiphora -

"— An abnormal overflow of tears, due usually to an obstruction of the tear duct. "[1]

" دوسری مسز سارک عجیب پٹی ہوئی روتی سی ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذرا سی بات پر پھوٹ کر رو پڑتیں اور پھر گھنٹوں منوائے کرواتیں ایک دوست مسز شد ھاہرا اسکول میں ان کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتی تھیں "[2]

مسز سارک بہت تھوڑے سے وقفے کے لئے ناول کے صفحات پر ابھرتی ہیں مگر اس کے باوجود ان میں Epiphero جیسی نفسیاتی بیماری کی جڑیں پوری طرح موجود ہیں۔

اسی طرح ناول میں کئی کردار احساس کمتری اور کئی کردار احساس برتری کے شکار ہیں۔ اس کی اچھی مثال "اعجاز" اور "عباس" ہیں۔ احساس کمتری کے وہ لوگ شکار ہوتے ہیں جو اپنی کمزوری کو سمجھنے کے باوجود اسے چھپانا چاہتے ہیں۔ احساس کمتری کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

---

[1] ڈکشنری آف سائکالوجی — جیمس ڈرون — ص ۸۵

[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۰۸

INFERIORITY COMPLEX :-

A complex arising from conflict between the impulse to seek recogni-tion (positive self implse) and feel of the hart arising from frustration frequent-ly experienced in simplar situations in the port resulting in defensive, com-pensatory, or often aggressive behaviour unconsciously determind must not be cenfused with inferiority feeling :-" ؎۱

اعجاز شمن کی خالہ کا لڑکا تھا چونکہ باپ کے انتقال کے بعد والدہ نے دوسری شادی کرلی تھی اور نئے والد کسی جلاد سے کم نہ تھے اس لئے ان کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ شمن کے گھر رہنے کے لئے آگیا تھا۔ اعجاز زبردست قسم کی احساس کمتری کا شکار تھا۔ نہ اسے بولنا آتا نہ بات کرنا۔

" وہ عموماً چپ چاپ الو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لوگ ارمان کرتے ہیں کہ ان کے بچے شریر نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ اٹھتے، وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں دوڑایا کرتا۔ اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی، ندیدی اور متحیر نظر آتیں "۔ ؎۲

اس لڑکے سے سوائے اس کی ماں کے اور کوئی محبت نہ کرتا حالانکہ وہ بہت فرماں بردار اور بے زبان تھا بغیر چون چرا کئے ہوئے دوسروں کا کام کرتا۔ مرغیوں کو دانا ڈالنا۔ کتے

؎۱ ڈکشنری آف سائکالوجی — جیمس ڈرون — ص ۱۳۶

؎۲ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۴۲

کو بچا ہوا کھانا ڈالتا اور دوڑ دوڑ کر سبھی کام کرتا۔

اجوّ یعنی اعجاز اس قدر احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ اس میں خود داری نام کو باقی نہ رہ گئی تھی وہ بڑے آرام سے کوئی بھی غلط سے غلط کام جھوٹے کھانے کے بدلے میں کرنے کو تیار رہتا گویا اس کی حس ماری گئی تھی اور وہ جذبہ جو ایک باشعور بچے میں ہوتا ہے "برا لگنے کا" اس میں نام کو نہ تھا۔

"یونگ کی طرح فرائڈ کے ہم عصر ماہر نفسیات اور شاگرد ایڈلر نے بھی بعض جگہ فرائڈ سے اختلاف کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان اپنی ذہنی یا جسمانی کمتری کو دور کرنے کے لئے تلافی طریقۂ کار compensation Method پر عمل کرتا ہے۔ ایڈلر کے خیال کے مطابق انسانی زندگی میں اولین ردعمل کمتری کا ہوتا ہے۔ جسم کی کسی عضوی کمتری کے باعث دوسرا عضو زیادہ نشو ونما پاکر اس کمتری کی تلافی کرلیتا ہے۔ ــــــ" [1]

اس ناول میں اجوّ بھی اسی Compensation Methods کے تحت اپنے آپ کو بدل لیتا ہے اور کافی سال بعد جب وہ تعلیم حاصل کر کے واپس آتا ہے تو اس کی کایا ہی پلٹ چکی ہوتی ہے۔

اعجاز وہ لڑکا جو شمن کا ایک لمس پانے کے لئے گھنٹوں پانی پینے کا بہانا کیا کرتا تھا اور آخر جب شمن نے اسے بالکل ہی نہ گردانا تو وہ شمن کا ایک جوتا لے کر بخار میں تپتا رہا تھا آج وہی لڑکا شمن سے اس کے بدلے اس کی دوست بلقیس کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔ اس نے دولت عزت حاصل کرلی تھی۔ اور اب اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کر کے وہ اپنی احساس برتری کو تسکین پہنچا رہا تھا۔

جس طرح احساس کمتری ایک نفسیاتی روگ ہے اسی طرح احساس برتری بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے، ہر شخص میں احساس برتری کا مادہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی

---

[1] جدید اردو تنقید۔ اصول و نظریات شارب ردولوی ص ۲۰۲

صورت میں پایا جاتا ہے۔ احساس برتری کا یہ جذبہ صاف اور سیدھے طور پر لوگ نہیں مانتے تو بھی جبلت مختلف طریقوں سے آسودہ ہونے کی طاقت رکھتی ہے اور اپنی تسکین کے لئے نئے نئے پیرائے ڈھونڈ سکتی ہے۔ احساس برتری انسان سے بلند کام بھی کروا سکتی ہے اور ذلیل بھی کر سکتی ہے۔

SUPERIORITY FEELING :-

Exaggerated self- valuation. not infrequently appears as a reaction or defence aginst an inferiorrity or inferiarity Compl- -ex :- [۱]

ٹیڑھی لکیر کے چند کردار جیسے عباس اس کے والد والدہ سبھی احساس برتری کے شکار ہیں۔ عباس ان کا اکلوتا بیٹا انگلینڈ سے انجنیری پاس کر کے آیا تھا عباس کے والدین اسی وجہ سے احساس برتری پیدا ہو گئی تھی اور وہ صاف صاف دیواروں پر پان کھا کر پیک تھوک کر اپنی احساس برتری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

عباس کا ہر لڑکی سے محبت کا دعویٰ اس کی احساس برتری کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ یہ اچھی طرح سے سمجھتا تھا کہ وہ جس لڑکی کو چاہے گا حاصل کر لے گا اور یہی خیال اسے اس طرح کی حرکتیں کرنے پر اکساتا بھی ہے۔ عباس ایسی چھچھوری عشق بازی کے ذریعہ "احساس برتری" کی تسکین حاصل کرتا ہے۔

عصمت چغتائی نے مردوں کی کئی قسموں کا بیان بالکل آم کی قسموں کی طرح ایلما کی زبان سے کروایا ہے۔ مردوں کی ایک خاص قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو عورتوں سے بہت زیادہ مانوس ہوتی ہے یہ لوگ غیر معمولی طور پر عورت کے پرستار۔ عیاش اور مکار ہوتے ہیں۔ افتخار اسی قسم کا مرد ہے۔ جو بیوی کے ہوتے ہوئے اوروں سے عشق لڑاتا ہے اور بھولی بھالی لڑکیوں کو پھنساتا ہے علم نفسیات میں اس طرح کے لوگوں

---

[۱] ڈکشنری آف سائکالوجی جیمس ڈروِن ص ۲۶۸

کے لیئے ایک خاص الفاظ استعمال کیا جاتا ہے "SATYRIASIS" جس کی تعریف کچھ اس طرح ہے۔

SATYRIASIS:-

SEXUAL INSANTLY OR AN EXAGGERATED SEXUAL DESIRE IN HUMAN MALES.

افتخار کی شخصیت شاندار اور بڑی رعب دار تھی کالج کے پریسیڈینٹ ہونے کے ناطے اس کا خوب رعب رہتا۔ پہلے وہ مس بوگا کو اپنے جال میں پھنسائے تھا یا یوں کہیۓ مس بوگا نے افتخار کو پھنسایا تھا اس کے بعد ایلما کا افتخار سے عشق چلا اور بات یہاں تک آ گئی کہ ایلما اپنا پہلا بچہ افتخار سے ہی چاہنے لگی۔

افتخار شمن کے بھولپن معصومیت اور سیدھے پن سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے اس کے جذبات کو اکساتا ہے اپنی محبت کا اقرار اس انداز سے کرتا ہے کہ شمن اس کو اپنا سچا عاشق محسوس کرتی ہے۔ اس طرح افتخار شمن کو محبت کے نام پر بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس نے شمن کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے اس سے ایسی مکاری کی باتیں کیں کہ جس لڑکی نے اس دنیا کو قریب سے نہ دیکھا ہو وہ یقیناً پھنس کر رہ جاتی۔ افتخار نے شمن کو اپنی زندگی کی بھولی بسری باتیں اس انداز سے سنائیں کہ وہ اور زیادہ افتخار کے قریب ہو گئی۔

افتخار شادی شدہ تھا وہ کئی بچوں کا باپ تھا مگر جب شمن اس سے شادی کے بارے میں پوچھتی ہے تو نہایت چالاکی اور مکاری کے ساتھ شادی کی بات اڑا جاتا ہے اس معاملے میں اس کی چرب زبانی اور فہانت اس کے کام آتی ہے۔

افتخار حالانکہ شادی شدہ تھا اور یہ خوب سمجھتا تھا کہ شمن چاہے جتنی تیز ہو اسے مردوں کے بارے میں ذرا بھی جانکاری نہیں ہے۔ وہ خوب سمجھ بوجھ کر باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ شمن کو اپنے جال میں پھنساتا ہے۔ اس سے اپنے لئے پیسے

لے ڈکشنری آف سائکالوجی جیمس ڈرون ص ۲۵۰

منگواتا ہے۔ دواؤں کے لئے پیسے لیتا ہے اور نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی بھی شمن کے خطوط کی بنیاد پر شمن کو بلیک میل کرتی ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ ٹیڑھی لکیر کے چند دیگر کرداروں میں "LUST" نام کی نفسیاتی بیماری پائی جاتی ہے یہ سبھی کردار ضرورت سے زیادہ جنسی خواہش اپنے اندر رکھتے ہیں اور اسی زیادتی کی وجہ سے وہ جنسیاتی کجروی کے شکار بھی ہو گئے ہیں۔ Lust نفسیات میں Sexual desire or appetite کو کہا جاتا ہے"۔[۱]

ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں بوگا۔ سیتل۔ بلقیس، رضیہ بیگم۔ رائے صاحب۔ شمن کی بڑی آپا۔ رشید۔ منجھو بی۔ آپا کی دوست عزیز بیگم اور شمن کے والدین وغیرہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔

ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمن کے کردار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یقیناً یہ کردار نفسیاتی الجھنوں و نفسیاتی بیماریوں کا مجموعہ نظر آئے گا۔ شروع سے لیکر آخر تک اس کردار میں نئی نئی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شمن اس ناول کا واحد کردار ہے جو نفسیاتی بیماریوں کا خزانہ سمجھا جا سکتا ہے۔ عصمت نے اس کردار کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا کہ

> "یہ ناول جب میں نے لکھا تو بہت بیمار تھی اور گھر میں پڑی رہا کرتی تھی اس لئے اس ناول میں میرا جی بہت لگا میں لیٹے لیٹے لکھتی یا لکھواتی تھی اس ناول کی ہیروئن "شمن" قریب قریب میں ہی ہوں بہت سی باتیں اس میں میری ہیں ویسے آٹھ دس لڑکیوں کو میں نے اس کردار میں جمع کیا ہے اور ایک لڑکی کو اوپر سے ڈال دیا ہے۔ جو میں ہوں۔ اس ناول کے حصوں کے بارے میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ کون سے حصے میرے ہیں اور کون سے دوسروں کے۔ ــــ"[۲]

اس میں عصمت نے نہ صرف الگ الگ لڑکیوں کے کردار ڈالے ہیں بلکہ طرح طرح کی نفسیاتی

---

[۱] ڈکشنری آف سائکالوجی — جیمس ڈروِن — ص ۱۶۶

[۲] شاعر۔ بمبئی — جلد ۴۷ — شمارہ ۱۹۷۶ء — ص ۱۵

الجھنوں کو ایک خاص عمر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شمن ایک ایسے گھر کی آخری اولاد ہے جس کو نا چاہا جاتا ہے نہ اس پر توجہ دی جاتی ہے بچپن سے ہی اسکو اپنے اکیلے پن کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کے اندر طرح طرح کے نفسیاتی عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔

کسی بھی لڑکی کا اپنی کسی ہم جنس سے محبت کرنا "SAPPHISM" کہلاتا ہے۔ جس کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ "Erotic Attachmant between women" شمن کو چونکہ اپنے گھر میں کسی کی محبت نہ مل سکی تھی اس وجہ سے جیسے ہی اسے کوئی چاہنے والا ملتا وہ اسے جی جان سے چاہنے لگتی۔ انا اور منجھو بی سے بچھڑنے کے بعد اسے مس چرن ہی ایسی ہستی دکھائی دی تھیں اور بہت جلدی وہ ان کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ہم جنسیت کے اسباب کے بارے میں داکر لکھتا ہے۔

"ہم جنسیت کے اسباب کے بارے میں ماہرین میں آجتک اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین وراثت پر زور دیتے ہیں تو بعض ماحول اور تربیت پر اصرار کرتے ہیں۔ غالباً حقیقت یہ ہے کہ موروثی اور ماحولی دونوں عناصر لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں عناصر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ بچے میں پیدائش کے وقت ایک ایسا قدرتی رجحان ہوتا ہے جو اُسے اس قسم کی جنسی گمراہیوں کی طرف لے جاتا ہے، جبکہ اس کی تربیت بھی نامناسب ہو۔" [1]

شمن میں چاہے جانے کا رجحان ضرور تھا کیونکہ ہر بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے چاہا جائے اس پر توجہ دی جائے اور جب یہ چاہت کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ کہیں بھی کسی سے بھی محبت کرنے لگتا ہے جو اسے تھوڑا سا بھی سہارا دے۔

"اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھانے لگا مس چرن کو دیکھ کر

---

[1] جنس کا نفسیاتی پہلو — داکر — ص۔ ۲۶۸

آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھنچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اسے
ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا، اپنی رگ و پے میں سرایت
کرتا ہوا معلوم ہوتا وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو شمن جو کام کر رہی ہوتی
اسے گڑبڑ کر دیتی۔ بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی۔ اگر وہ کسی اور درجہ
کو کوئی کھیل کھیلاتی ہوتی تو اس کے لئے پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ رہ رہ کر
ان کے قہقہے اُسے سر سے پیر تک لرزا دیتے۔ ـــــــ“ [1]

شمن کو چونکہ بچپن میں ماں کی محبت نہ ملی اس کی ماں نے صرف اسے پیدا کیا تھا
روتی بلکتی شمن کو انا کے پاس ڈال دیا گیا مگر انا کو بھی شمن سے صرف اتنی دلچسپی تھی
کہ شمن کو پالنے کا اسے پیسہ ملتا تھا۔ وہ روتی رہتی انا اپنے عاشق سے عشق لڑاتی رہتی
اس کے بعد ناتجربے کار زہین منجھو بی کو اس پر ترس آگیا۔ مگر بچہ پیدا کرنے سے
پہلے کوئی ماں نہیں بن سکتا لہذا یہاں بھی شمن محبت اور ممتا کے لئے پیاسی ہی
رہی محبت اور ممتا کے لئے ترستی شمن جب مس چرن کے قریب آتی ہے
تو وہ انہیں دل و جان سے چاہنے لگتی ہے۔ ان کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہے
مس چرن سے شمن کا لگاؤ اور محبت اسی پیرائے میں آتا ہے۔

علم نفسیات کے مطابق ”MASOCHISM“ ساکیت اور سادیت
”SADISM“ دو ایسے امراض ہیں جن میں انسان دوسروں کو اور اپنے آپ
کو تکلیف پہنچا کر سکون حاصل کرتا ہے۔

MASOCHISM:-

pleasure particularly sexual pleasure
in suffuring physical pain, interpreted
psychoanalytically, trms of the des-
-tructive or death instincts, erati-

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۷۰

-cally bound. ــــــ" [۱]

ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمن کو جہاں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر سکون ملتا ہے وہیں خود اپنے آپ کو بھی تکلیف پہنچا کر لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی کامیابی پر مسکراتی ہے۔

"یہاں تک کہ ایک دن اس نے کوئی معقول بہانا نہ پایا تو چپکے سے بلیڈ سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی ــــــ" [۲]

صرف یہی نہیں کہ اپنے سے ہی اپنے کو تکلیف دے کر وہ خوشی محسوس کرتی بلکہ اُسے منجھو نے بہت دنوں بعد سسرال سے آنے کے بعد مارا تو اسے بہت خوشی محسوس ہوئی۔

"منجھو نے کس کس کے دو گھونسے جمائے۔ شمن پھوٹ پڑی دُکھ سے نہیں، ان توجہ بھرے گھونسوں کی لذت سے اس کا جی دکھ اٹھا۔۔۔

....

منجھو کے گھونسے کی شیرینی جس کے لئے وہ ترس گئی تھی اس کی رگ رگ میں تیر گئی۔ اور پھر گھونسوں تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا ــــــ" [۳]

یہ سادیت کی اچھی مثال ہے ٹھیک اسی طرح کی مثال بیدی کے اکلوتے ناولٹ ایک چادر میلی سی میں بھی ملتی ہے۔ جب منگل رانوں کو مارتا ہے بجائے اس کے کہ وہ روتی افسوس کرتی کہ آج اس کا نیا شوہر بھی وہی سب حرکت کر رہا ہے جس کے خلاف اس نے آواز اٹھائی تھی وہ خوش ہوئی اور بھولی بسری میٹھی یادوں میں کھو گئی۔

---

[۱] ڈکشنری آف سائکالوجی — جیمس ڈرون — ص ۱۶۴

[۲] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۷۸

[۳] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۳۴

شمن کو جب بھی غصہ آتا وہ اس کا اظہار نہ کر پاتی یا اپنی تسکین نہ کر پاتی تو بیٹھے بیٹھے وہ اپنے خیالات کی تکمیل کر لیتی ہے۔ اس وجہ سے اُسے دن میں خواب بھی آنے لگے۔ یہ بیماری خاص کر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو موجودہ حالات سے خوش نہیں ہوتے یا جن کی خواہش پوری نہیں ہو پاتی ایسے لوگ DAY DREAMING کرنے لگتے ہیں یعنی بیٹھے بیٹھے خواب کی دنیا میں کھو جانا۔ سائکالوجی میں اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

DAY DREAMING :-

Type of phantasy, in which the individual allows his mind to wan-der aimlessly among pleasant image-ry gratifying wishes ungratifeed in real life —" [1]

شمن اس مرض میں بھی مبتلا ہے۔ وہ دن میں بار بار طرح طرح کی بیوقوفیوں کے خواب دیکھتی ہے جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور جن میں اس کی خواہشات چھپی ہوتیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

" اور پھر وہ سوچنے لگی ___ اس نے گڑھا کھود کر منجھو کی سانس کو بو دیا ہے .... دوسرے دن کلا پھوٹ رہا ہے .... بھورا بھورا چتیوں دار ___ سپیرے ٹوکریوں میں اژدہا لئے پھرتے ہیں نا ___ بالکل ویسا ___ شمن خوشی سے دیوانی، دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے، پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے بھی اونچا ہو گیا اور نمکولیوں کی طرح گچھے کے گچھے مرگھلی سڑی ہوئی کبڑی بڑھیوں کے لٹکنے لگے۔ ایک لمبا سا بانس لے کر وہ انہیں جھاڑنے لگی جیسے پکی پکی املیاں۔ سارا آنگن بڑھیوں سے پٹ گیا، ہزاروں، لاکھوں کھانستی ۔ چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پان دان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پر بیٹھی چھالیا کتر رہی ہے۔ آٹھ دس

---

[1] ڈکشنری آف سائکالوجی جیمس ڈروِن ص ۶۰

باورچی خانے میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں، دو چار اچار کی مٹکیوں کے
پاس پھدک رہی ہیں، مُنّی مُنّی مکڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں
اودھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم اُن بڑھیوں سے گھبرا اٹھی اور دونوں
ہاتھوں سے انہیں دور دور کرنے لگی ــــــ "[1]

یہ خواب نہ صرف اس کی تشنہ خواہش کو پورا کرتا نظر آتا ہے بلکہ اس کے دل میں بڑھیا کے لئے جس طرح کے جذبات تھے اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔

جس طرح دن میں بیٹھے بیٹھے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا ایک کمزوری ہے ایک بیماری ہے ٹھیک اسی طرح رات میں ڈروانے خواب دیکھنا اور پریشان یا خوف کی حالت میں بیدار ہونا۔ دوڑنے بھاگنے۔ چیخنے چلانے اور پریشانی کا خواب دیکھنا بھی نفسیاتی مرض ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے جب انسان اپنی پریشانی اوروں سے کہتا نہیں اور وہ باتیں اس کے دماغ میں پکتی رہتی ہیں۔ اس بیماری کو "NIGHT TERRORS" کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

" Very disturbing or frightening dreams from which the individual wakes in a state of terrer — "

"NIGHT TERRORS" کی کئی اچھی مثالیں ٹیڑھی لکیر میں موجود ہیں۔ شمن اکثر جگہ اس بیماری میں مبتلا نظر آتی ہے۔

" رات بھر اُسے عجیب عجیب واہمے خواب بن بن کر ستاتے رہتے، کبھی کالج
کے غنڈے اُسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے۔ کبھی
دیکھتی وہ شیشے جیسے چکنے پہاڑ پر الٹی پھسل رہی ہے۔ اور اس کے
کپڑے تار تار ہو گئے ہیں۔ ہتھیلیاں چھل گئی ہیں! کبھی دیکھتی مہترن چھوٹے
بھنگی کی پیٹھ پر سوار اسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے۔ وہ غسل خانے میں

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۴۴

بہار ہی ہے کہ حبشی نژاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیے۔ وہ چیخ مار کر گر پڑی مری ہو گئی ——" [۱]

"ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی ——
دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم سے وہ اٹھ کر ناچنے لگے انکے بازوؤں کے پٹھے پھول پھول کر اچھلنے لگے اور بال گز گز بھر کے سانپوں کی طرح کھڑے ہو کر جھومنے لگے۔ مصنوعی دانت سُر تال میں بجنے لگے ...... تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے اور وہ شمن کی طرف بڑھے ... ... اس نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن انہوں نے اس کی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ شمن متواتر چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی ——" [۲]

شمن کا ڈراونا خواب دیکھنا خوف کی حالت میں چیخنا چلانا اور ڈر کر خوفزدہ ہو جانا اس کی ذہنی کمزوری کی علامت ہے جسے عصمت چغتائی نے بڑی ہنر مندی سے بیان کیا ہے۔
شمن میں ان بیماریوں کے علاوہ کچھ اور نفسیاتی بیماریاں بھی موجود ہیں۔ ایک نفسیاتی بیماری "KLEPTOMANIA" یہ بھی شمن میں موجود ہے۔

"An obsessive inbulse to steal, not infrequently shown in stealing objects for which the individual has no desire —" [۳]

ہم دیکھتے ہیں کہ ناول جس طرح قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے اسی طرح اس کردار کا ٹیڑھا پن اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔ طرح طرح کی کجروی اس کردار کو ٹیڑھے سے ٹیڑھا

۱؎ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۷۶
۲؎ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۰۵
۳؎ ڈکشنری آف سائکالوجی — جیمس ڈرون — ص ۱۵۱

بنا رہی ہے۔ اِسی ٹیڑھے پن میں ایک اور اضافہ ہوتا ہے۔
"KLEPTOMANIA" سے انسان جب تعلیم حاصل کرتا ہے تو عام طور سے اچھے سے اور اچھا اور برے سے اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کے برخلاف کچھ لوگ صرف برائی حاصل کرتے ہیں اور ایسے لوگ اچھائی کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں یا انہیں اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔ شمن بھی اسی طرح کی ہے۔ جب وہ پہلی بار ہاسٹل رہنے جاتی ہے تو واپس آنے پر کئی طرح کی اور بری عادتیں اس میں آگئی تھیں بغیر ضرورت چوری کرنا ان میں سے ایک تھا۔

"اس کے علاوہ اُسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی مہارت ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانے میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چرا کر بغل میں دبا لیتی کہ خوب خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور منہ میں لقمہ لے کر وہ گن گناتی ہوئی چلی جاتی تاکہ کوئی سوچے اس کا منہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ چوری کی چیز وہ نہایت تن دہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈتی۔ یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا ــــــ"[1]

نفسیاتی بیماریوں میں ایک بیماری "REVENGE" بدلہ لینا بھی ہے۔ یعنی انتقام کا جذبہ۔ اس کے تحت انسان میں اپنی بے عزتی اور کمزوری کا بدلہ لینے کی زبردست خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ شخص کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں بدلہ لے ہی لیتا ہے۔ شمن شروع سے آخر تک لوگوں سے اپنی بے عزتی ناانصافی اور بدکلامی کا بدلہ لیتی رہی ہے۔ "REVENGE" کی تعریف یہ ہے۔

"REVENGE":-

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۶۹

"Deliberate infliction of injury upon others Individuals or groups, from whoom injury has been recived" ___ ۱؎

منجھو بی کی مار تو شمن سہ لیتی تھی مگر اِدھر کچھ دنوں سے اس کا بھی جی چاہتا کہ وہ منجھو کو خوب مارے

"...... پھر تخیل میں ہی وہ منجھو بی کو پیٹنے لگتی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اُسے کہیں سے اپنی بھولی بسری انا کا دھندلا سا خاکہ یاد آجاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصہ چڑھتا اور وہ منجھو کے سر پر بیسن ڈال کر خوب گھسے لگاتی زور زور سے جھانوے سے اس کی کہنیاں اور گٹے چھیلنے لگتی پھر کھردرا سا تولیہ لے کر اتنا رگڑتی کہ منجھو کی کھال اُتر جاتی اور ناک لال چقندر ہو جاتی ایک کان کی لو ٹوٹ کر تولیہ ہی میں الجھ آئی ___" ۲؎

اسی طرح شمن نے رسول فاطمہ سے اس کے کیئے کا بدلہ لیا۔

"وہ چپکے سے اٹھی اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کنڈی چڑھا سیدھی اپنے کمرے میں ...... رسول فاطمہ نے چونک کر اُسے پکارا "شمن"! مگر وہ تیز تیز قدم چل پڑی ...... کمرے میں پہنچ کر اس کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ___ پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش دبے قہقہوں میں ڈوب گئی ___" ۳؎

سردی کے موسم میں رسول فاطمہ کو نماز کے کمرے میں بند کر دینا اس کے بدلے کے جذبات کو پیش کرتا ہے۔

اپنی زندگی کا دوسرا بدلہ شمن نے اس وقت لیا جب اچھّو اس کا بچپن کا منگیتر شمن کی دوست بلقیس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے مگر پھر شمن کی شادی کی بات

۱؎	ڈکشنری آف سائکالوجی	جیمس ڈروِن	ص	۲۵۱
۲؎	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۰
۳؎	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۸۹

اچّو سے چل نکلتی ہے۔ شمن اعجاز عرف اچّو سے بدلہ شادی سے صاف انکار کرکے لیتی ہے۔

"اس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے، جھگڑے اُٹھے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونگ رچے مگر کالج جاکر اس نے صاف صاف انکار لکھ دیا۔ اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا .... زور لگا کر اُس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا بغاوت! اس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اٹھی اُسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیئے امیدیں خاک میں ملا دیں، اوہ کتنی ظالم تھی وہ؟"[۱]

یقیناً شمن کی بڑی آپا نے اس کی زندگی میں زہر گھولا تھا۔ جب وہ بیوہ ہو کر گھر آتیں ہیں تو سب سے زیادہ مصیبت شمن پر ہی ٹوٹتی۔ وہ بات بات پر شمن کو ذلیل کرتیں اسے ڈانٹتیں اور مارتیں اس کا بدلہ شمن نے ان کی کیاری کو تباہ کر کے لیا۔

"بڑی آپا کی کیاریاں! آناً فاناً میں وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے کھسوٹنا شروع کیا جیسے وہ اپنے کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو اور بھر مٹھیوں میں لیکر اس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ۔ لوکی کی بیل، چمیلی اور موگرے کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اسے ہنسی آنے لگی"[۲]

اس طرح اس نے ہر اس انسان سے بدلہ لیا جس نے اس کا ذرا سا بھی دل دکھایا تھا۔ بعد کی زندگی میں اس نے انقلابی شاعر۔ کامریڈ صمد اور ٹیلر وغیرہ سے بدلہ لے کر اپنی انتقام کی آگ بجھائی۔

۱	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۲۱
۲	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۳۸

سادیت اپنے اوائلی اظہار میں جنسی بے راہ روی کا ایک عام وقوعہ نظر آتی ہے سادیت کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں: احساس لطف (انتہائی ہیجان) کا ایسا تجربہ جو اوپر یا دوسروں (انسانوں یا جانوروں) پر سفاکانہ اعمال یا جسمانی زدوکوب کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو ذلیل کرنے، چوٹ پہنچانے، مجروح کرنے حتیٰ کہ نیست و نابود کرنے کے ذریعہ جنسی لطف حاصل کرنے کو بھی سادیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن اس مرض میں شروع سے ہی مبتلا رہی ہے۔ اور اس ناول میں کئی جگہ سادیت پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔ شمن اکثر جنونی حالت میں چیزوں کو نوچتی ہے مارتی ہے جب انسانوں پر بس نہیں چلتا ہے تو وہ چیزوں کو خاص کر اپنی گڑیا پر غصہ کا اظہار کرتی ہے۔ لوگوں کو مارنا۔ پیٹنا۔ دانت کاٹنا وغیرہ تو اس کا پسندیدہ کام تھا۔ شمن کی آپا جب اس پر حکم چلانے لگی بار بار لوگوں کے سامنے اسے نوری کے مقابلے میں نیچا دکھانے لگی تو وہ نہایت غصہ اور جنون کی حالت میں ان سے بدلہ لینے کی خواہش مند نظر آتی ہے اور جب اس کا بس آپا پر نہ چلا تو وہ ان کی کیاری پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

شمن کی بڑی بہن منجھو بی جس نے شمن کی پرورش کی تھی وہ شمن کو ہمیشہ صاف ستھرا دیکھنا چاہتی تھی۔ شمن کو نہلا کر صاف اور اچھی فراک پہنا کر اسے صاف رہنے کی ہدایت دیتی شمن کو خوب معلوم تھا کہ کپڑا گندا کرنے پر منجھو کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور جب منجھو بی سسرال سے واپس آئی تو شمن منجھو کو تکلیف پہنچانے کا ایک نیا طریقہ تلاش کر لیتی ہے۔

"بس بس، اب ٹھیک ہوئیں اس نے تخیل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہ وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اُسے نہلایا تھا، بال سنوارے تھے، تو بس اب اس کی یہی سزا ہے! اس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں ڈالیں۔ خوب کیاری کی کیچڑ میں تلا بازیاں لگائیں۔ زمین پر تھوک کر ہتھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی ہتھیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھیر لیں"، [1]

صرف اتنا ہی نہیں شمن نے جیسے جیسے زندگی میں قدم آگے بڑھایا تھا دوسروں کو تکلیف

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۳۸

پہنچانے اور ٹیس کرنے میں اسے مزا آنے لگا تھا، ٹیلر سے شادی ہو جانے کے بعد شمن نے بہت سی باتیں انجانے میں ہی سیکھ لی تھیں مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی ان باتوں سے ٹیلر خوش ہوتا ہے تو اس نے فوراً موقع دیکھ کر اچھی عادتوں کو چھوڑنے کی قسم کھالی۔ تاکہ ٹیلر کو زیادہ جلا سکے تکلیف پہنچا سکے۔

"وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ اور کرتا پہننا شروع کیا۔" [1]

شمن کو معلوم تھا کہ ٹیلر کی والدہ کو بچوں کا بہت شوق ہے اور عام طور سے ہر ساس اپنی بہو سے بچہ کی خواہش رکھتی ہے۔ مگر شمن نے یہاں نہ صرف اس بوڑھی ساس کا دل دکھایا بلکہ ان کے جذبات کا مذاق بھی اڑایا۔

"___ ممی ___ ان کی خواہش ہے ___" کچھ کہتے کہتے رک گیا شدت احساس سے کان سرخ ہو گئے "ممی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں وہ خود خلاف ہوں گی۔"

"کون ممی ...... ارے توبہ کرو ..... دیوانی ہیں وہ بچوں کی ...... تمام ادھر ادھر کے بچوں کو چمٹائے رکھتی ہیں۔

"تو اب بھی ادھر ادھر کے بچے موجود ہیں شوق سے چمٹائیں ___"۔ [2]

شمن شادی کرنے کے بعد بھی اپنی عادت سے نجات نہ پا سکی تھی۔ اس میں اور ٹیلر میں بہت لڑائیاں ہوتیں، وہ ایسی ایسی بات کہتی جس سے ٹیلر کو خوب تکلیف ہو اور رنج ہو یہ اس کی عادت تھی اور وہ عادت کی غلام۔

"___ تم ___ تم بیسوا سے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو ___ ...... کاش ایک بار کوئی تمہارا گلا گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے ....."

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۵۹
[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۷۳

اور تمہیں کیوں نہ مسل ڈالے، جونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں بہنوں کو تو دیکھو .... بدمعاش رنانے بھرکی ...."

"چپ کم بخت .... گلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے بھتوہرسے ناتا جوڑا ...."

اور تم ...... بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت سڑے ہوئے دانت بندر کہیں کے۔ ...."

"تو پھر کسی بھیل چمار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی باحیا ہو تو نکل جاؤ یہاں سے۔"

"بھیل چمار تم سے لاکھ درجہ بہتر ہے ٹامی کہیں کے۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

شمن کو خوب معلوم تھا کہ ٹامی کا مطلب ہندستانی میں اُس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے شمن نے اپنی عادت کے مطابق اسے خوب تنگ کیا پریشان کیا اسے خوب ٹمس کیا اور یہاں تک کہ وہ غصّہ سے پاگل ہو گیا اور اپنے جذبات کو روک نہ سکا مرد ہو کر وہ رونے لگا اور گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

"اور پھر سسکیوں کی آواز آئی جیسے کوئی دم گھونٹ کر رونا ضبط کر رہا ہو۔ شمن کا جی ہل گیا۔ وہ رو رہا تھا ٹیلر ہٹا کٹا قد آور جوان مرد ایک عورت کے مارے ہوئے ڈنکوں پر سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا جا کر ...... مگر وہ لرز اٹھی۔ وہ نیلی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں وہ تمتمایا ہوا چہرہ ——[2]

اس ناول کا انجام ٹیلر کا محاذ پر روانہ ہونا ہے۔ یہ سب شمن کی ہی بدولت ہوا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شمن بہ یک وقت ایک دو نہیں بلکہ کئی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہے۔ شمن کی تخفیف

---

[1] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۷۴

[2] ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۷۵

نفسیاتی بیماریوں کے ساتھ ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے چیونٹیوں بھرا کباب۔
اس طور "ٹیڑھی لکیر" میں انسانی نفسیات بالخصوص نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کی مثالیں جا بجا نظر آتیں ہیں۔ اس لئے ٹیڑھی لکیر کو اردو میں نفسیاتی الجھنوں کا مرقع یا اپنی نوعیت کا سب سے منفرد نفسیاتی ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ٹیڑھی لکیر کا اسلوب و زبان

کسی بھی ناول کے معیار کو جانچنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس ناول کے قصے، پلاٹ، کردار، فضا، ماحول اور اس میں پیش کیے گئے نظریۂ حیات کے علاوہ ناقدینِ فن اس کے اسلوب اور زبان کے محاسن و معائب کا بھی جائزہ لیتے ہیں کیوں کہ فنِ ناول نگاری میں اسلوب و زبان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اطہر پرویز اپنی کتاب ادب کا مطالعہ میں لکھتے ہیں۔

"جس طرح بت تراش مجسمہ بنانے کے بعد اس کے جذبات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی نوک پلک درست کرتا ہے اسی طرح ایک بڑا ناول نگار اپنے ناول کے مواد کو مرتب کرنے کے بعد اس کے فنی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ ناول کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے اور اس میں تناسب پیدا کرتا ہے یہ دیکھتا ہے کہ زبان صحیح ہے اور پورے طور پر موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں، ناول نگاری تخلیقی فن ہے۔ اس کے لئے بھی اسی فنی اہتمام کی ضرورت ہے جس کی شاعری میں توقع کی جاتی ہے۔ یہاں بھی الفاظ کی جادوگری اپنا کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محاورات بھی اسی اہتمام سے استعمال ہوتے ہیں۔ بات کتنی ہی اچھی ہو لیکن اگر ڈھنگ سے نہ کہی جائیگی تو اس کے پڑھنے والے یا سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا۔" [۱]

---

[۱] ادب کا مطالعہ۔ اطہر پرویز ص۔ ۸۷

گویا کسی بات کو صرف کہہ دینا ہی ناول کے لئے کافی نہیں بلکہ اس انداز میں کہنا لازمی ہوتا ہے جس سے بات میں اثر پیدا ہو۔ عصمت چغتائی ایک تو بات اشاروں کناروں میں زیادہ کہتی ہیں دوسرے کسی بات کو براہ راست نہیں بلکہ مخصوص طنزیہ انداز میں کہتی ہیں۔ ان کے اشارے نہایت بلیغ ہوتے ہیں مگر انہیں سمجھنے میں قاری کو کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یعنی ان کے اشارے کسی بھی سطح پر ترسیل کی ناکامی کا المیہ نہیں بنتے۔ اس طرح ان کے طنز میں خاص کاٹ ہوتی ہے۔ طنز کا کوئی وار خالی نہیں جاتا۔ لیکن وہ طنز کو کہیں بھی "زہر قند" نہیں بننے دیتی ہیں۔ اس لئے طنز کا اثر کاری ہوتا ہے۔ معروف و ممتاز ترقی پسند نقاد مجنوں گورکھپوری عصمت کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "لوگ کہتے ہیں کہ عصمت نے بے باکی اور عریانی میں مردوں کے بھی کان کاٹے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس انداز کی جنسیاتی بے باکی جس کو عریانی کہنا تو خیر غلط بیانی ہے اس لئے کہ عصمت کا فن اشاریت ہے امردوں کے محکمہ کی چیز ہی نہیں ہے۔ غور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ ایسی جرأت ایک طناز عورت ہی کر سکتی ہے جو باغی ہو گئی ہو۔ اور عصمت ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں ان کو باغی تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ان کی بغاوت ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔" [۱]

مجنوں گورکھپوری کے نزدیک عصمت چغتائی ایک باغی فن کارہ ہیں۔ بغاوت ان کا پہلا وصف ہے اور ترقی پسندی ثانوی چیز ہے۔ مجنوں ایسے بالغ نظر نقاد بے باکی اور عریانی کو صرف مردوں کے دائرہ اظہار کی چیزیں نہیں مانتے۔ وہ اس معاملے میں عورتوں اور مردوں کی تخصیص کے قائل نہیں۔ دراصل ادب میں عریانیت اور فحاشی کا مسئلہ اتنا دشوار گزار مرحلہ ہے جسے حل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔ بسا اوقات عام لوگوں کی نظر میں جو چیز فحاشی یا عریانیت کا نام پاتی ہے عین ممکن ہے وہی چیز ایک صالح ادبی نقاد کے نزدیک فن کی معراج قرار پائے۔ اردو ادب بالخصوص شاعری میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً شاہ سراج کی مثنوی "خواب و خیال" ہی کو لے لیجیے۔ اس میں بیان کردہ واقعات عشق کیفیات

۱۔ نکات مجنوں — مجنوں گورکھپوری — ص ۳۲۵

قلمی کو بعض ثقہ قارئین نے " بوالہوسی " اور " حیا سوزی " سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک یہی مثنوی صوفیانہ اسرار و رموز کی حامل اور فن کا بہترین نمونہ قرار پائی ہے۔ اس طرح عصمت کی جنسیاتی بے باکی کو مجنوں گورکھپوری جیسے بزرگ اور معتبر نقاد " عریانیت " ماننے کے لیئے تیار نہیں کیوں کہ وہ فن اور عریانیت کے حدود سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لیئے وہ نہایت ذمے داری کے ساتھ محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے عصمت کے فن کو اشاریت کا فن قرار دیتے ہیں جو کہ ایک دیانت دارانہ اور مستحسن اقدام ہے۔

عصمت بات کو اس انداز سے پیش کرتی ہیں کہ پورا منظر نظر میں گھوم جاتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں شمن کی پیدائش کا منظر ملاحظہ ہو۔

" وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمٰی کی شادی تھی اور وہ بیٹھی چھپا چھپ سرونی کریپ کے دوپٹے پر چمکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا سارا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی گلے میں گھانٹی کئے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی " ؎۱

اس اقتباس کی خوب صورتی ایک تو عصمت کے انداز بیان میں چھپی ہوئی ہے دوسرے چند الفاظ کے سہارے ایک غیر معمولی واقعے کو اس کے پورے کوائف کے ساتھ، اختصار کے ساتھ بیان کرنا عصمت کی ہی خوبی ہے۔ جیسے 'وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی' یہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے گویا اب بچوں کو بھی موقع محل دیکھ کر دنیا میں قدم رکھنا چاہیئے۔ اور دیکھیے ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور بغیر گلے میں گھانٹی کئے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی۔ ان باتوں کو بہت آسان جملوں میں کہا جا سکتا تھا۔ مگر عصمت کا اندازِ بیان کچھ اور ہی ہے۔ ان کی زبان میں متوسط طبقے کی عورت اپنے طبقے کا قصہ بیان

؎۱ ٹیڑھی لکیر ۔ عصمت چغتائی ص ۱۱

کررہی ہے۔ وہی الفاظ، وہی اشارے وہی کنائے، گویا عصمت الفاظ کو نئے معنی اور مفہوم میں استعمال کرنے کا گر جانتی ہیں۔ کرشن چندر اپنے ایک مضمون "میرے ہمدم میرے دوست" میں لکھتے ہیں

"عصمت سے بات کرنا نہایت آسان ہے
اور ختم کرنا نہایت مشکل۔ یہی بات ان کی ناول میں ہے
ایک بار شروع کر دیجئے تو کہاں پر کس مقام پر ہم رو کیں یہی سوال
بار بار دل میں اٹھتا ہے اور اس طرح کئی صفحات اور آگے ہم بڑھ جاتے
ہیں۔ عصمت بہت سی چھوٹی موٹی اور غیر اہم باتوں کو بھی اس طرح پیش
کرتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں" ارے اسے بھی آپ کی توجہ کی ضرورت
لاحق ہے۔ ذرا رکیے، پڑھیے، غور کیجیے اور سمجھیے" ۵؎

عصمت چغتائی شمالی ہند کے مسلمانوں کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیئے ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی اس طبقے کی بہترین اور حقیقی عکاسی ملتی ہے۔ کیوں کہ یہ طبقہ اس کی خواتین اور اس کے مرد، اس کے بچے اس کے بوڑھے اور بوڑھیاں سب کے عادات و اطوار اور خوبیوں اور خامیوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان گھروں کی روز مرہ زندگی کی سچی تصویریں دیکھنی ہوں تو عصمت چغتائی کی تحریروں ہی میں نظر آئیں گی۔ کیوں کہ عصمت اس طبقے کی "محرم راز" بھی ہیں اور سچی نبض شناس بھی۔ لیکن وہ اس راز میں ایک خاص سلیقے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی شامل کر لیتی ہیں اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی سے یکلخت سارے پردے گرا دیتی ہیں اور قارئین کی نظروں میں وہ ساری چیزیں سما جاتی ہیں جن سے اب تک وہ ناآشنائے محض تھا۔ ایسے مواقع پر عصمت کا رویہ کسی شرارتی بچے کی طرح محسوس ہوتا ہے جو صرف اور صرف تجسس کی خاطر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس کبھی کبھی وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ زندگی کے حقائق کی ایسی تصویر کشی بھی کرتی ہیں جو صرف انہیں کا حصہ معلوم

۵؎ کرشن چندر۔ میرے ہمدم میرے دوست

ہوتا ہے۔ بزرگ ناقد کشن پرشاد کول "عصمت چغتائی کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں جو ہم نے اور آپ نے اپنے اپنے گھروں میں سنی اور دیکھی ہیں۔ ہم میں سے اکثر پر خود کبھی بیتی ہوں گی۔ ان میں سے جو باتیں مکروہ ہیں ان کو تو اس وقت دماغ سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ورنہ دماغ کیسے صحیح رہے جو کسی قدر شہوانی ہیں اور بعض بچپن کی باتیں سہانی معلوم ہوتی ہیں وہ کچھ دن یاد رہ جاتی ہیں اور پھر ہم انہیں بھول جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے بھی یہ باتیں سنی اور دیکھی ہیں۔ شاید ان پر بھی بیتی ہوں۔ ان کو یاد رہ گئیں انہوں نے ان پر غور کیا ہے۔ ان کے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو بلا تکلف کہہ دینے کی ہمت کی ہے۔ ہمارے گھروں کی کیا کیفیت ہوتی ہے ہم اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کس طرح کرتے ہیں اس ناول کے تقریباً سو صفحوں میں انہوں نے اس کا ہو بہو نقشہ اس طرح اتارا ہے کہ پوری تصویر ہماری نگاہوں تلے پھر جاتی ہے۔"[۱]

عصمت نے شمن کے کردار کا ارتقا اس ناول میں اس فن کاری اور باریکی سے دکھایا ہے کہ کہیں بھی غیر فطری محسوس نہیں ہوتا۔ گویا اس معاملے میں انہیں تخیل سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمن عمر سے بڑی اور زیادہ عقلمند ہے۔ مٹی کھانا، دھول مٹی گندگی میں کھیلنا شاید ہی کسی بچہ کی فطرت میں شامل نہ ہو۔ مگر عصمت اس کے بیان میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ صرف بچوں کے عادات و اطوار ہی نہیں بلکہ بڑوں کے رویوں کی تصویریں بھی جس خوبی سے کھینچی ہیں وہ عصمت ہی کا کمال ہے۔ گھریلو زبان کی تو آپ ملکہ ہیں جیسے نیا جوڑا پہنا کر آپ نے سب کے سامنے پیش

---

۱ نیا ادب: کشن پرشاد کول ۔ ص ۔ ۲۴۴

کردیا ہے۔ مٹی کھانے اور اس پر بڑوں کا غصّہ ہونا اور پھر بچوں کے نہلانے کا ذکر ملاحظہ ہو۔ جس میں بچوں کی معصوم فطرت کی خوب صورت جھلکیاں عصمت کے فن کا لاجواب نمونہ بن کر ابھری ہیں۔

"وہ زور سے بھینس کے پڈے کی طرح ڈکراتی ـــــ پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دھُل جاتی اور کھار کی وجہ سے دونوں نتھنے سٹ سے کھل جاتے جیسے اٹی ہوئی نالی میں تیزاب ڈال دیا ہو۔ پھر گھونسوں اور گرجدار دھموکوں کے شادیانوں کے ساتھ غسلِ میت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی وہ پختہ فیصلہ کرلیتی کہ اب کیچڑ اور مٹی سے تو کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ دھول میں لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اس کے چہرے پر تارک الدنیا سادھو کا سا استقلال چھا جاتا۔ جو اپنے جسم کے کسی عضو کو معطل کرلینے کا قصد کرچکا ہو۔ چیل جیسی چوکنا آنکھیں، کبوتر کی طرح معصوم ہو کر او نگھنے لگتیں" [۱]

عصمت اپنے اردگرد کی زندگی اور آس پاس کے ماحول کو بالکل اس طرح بیان کرتی ہیں جیسا کہ وہ ہے اس میں گندگی بھی ہے غلاظت بھی۔ گائے، بیل، مرغیاں، کتّے اور ان سب کے درمیان ننھے منّے، سنجیدہ اور شریر ہر طرح کے بچے بھی ہیں۔ ان کی غربت بھی ہے اور ان سب کے ساتھ ساتھ دبی سہمی لڑکیاں بھی ہیں۔ بقول مظہر امام

"عصمت کی دنیا غربت، جہالت اور غلاظت کی دنیا ہے۔ مشترکہ خاندان میں کیڑے مکوڑوں کی طرح پلنے والے بچّے پیشاب پیخانے کی سڑاند اور بساند، میل

---

[۱] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص۔ ۱۶

اور پسینے میں اٹی ہوئی خادمائیں۔ دبی دبی گھٹی گھٹی پردے کے پیچھے سے جھانکنے والی ناکتخدا لڑکی جو پردے ہی پردے میں ناجائز بچے بھی پیدا کر لیتی ہے۔ عصمت پردے کے پیچھے کلبلاتے ہوئے احساسات و جذبات کی مصوری تیز چکاچوند پیدا کرنے والے رنگوں سے کرتی ہیں۔" لہ

مظہر امام یہ بات ان کے افسانوں کے لئے لکھتے ہیں مگر عصمت کے ناول ٹیڑھی لکیر پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ اس میں بھی عام گھروں کے حالات بے کم و کاست الفاظ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ عصمت کے صرف دو چار جملوں سے گھر کے حالات لوگوں کے خیالات اور سماج کی رسم و رواج کی طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے۔ اس بیان سے ایسا نقشہ کھنچتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم صرف پڑھ نہیں رہے بلکہ اپنے یا کسی ساتھی کے بچپن کا حال کسی بزرگ سے سن رہے ہیں۔ عصمت کہیں لمبی چوڑی باتیں کرنے لگتی ہیں تو کہیں چند ایسے جملے اچھال دیتی ہیں جس سے گھر کا پورا معاشی، تعلیمی اور سماجی پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ چند فقرے اور جملے ملاحظہ ہوں۔

"دو بھینسوں کے دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی ان کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔" ؎۲

چونکہ گھر میں لوگ زیادہ ہیں اس وجہ سے دو بھینسوں کا دودھ بھی کم پڑتا ہے۔ اس طرح شمن کو نجوبی بتاتی ہیں کہ ابھی تو یہ کتاب یعنی پڑھائی کی ابتدا ہے بعد میں بھائی جیسی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔ صرف اس جملے کے علاوہ پوری ناول میں کہیں گھر والوں کی طرف سے پڑھائی کا ذکر نہیں ملتا۔

"پھر بڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا۔" ؎۳

لہ الفاظ مظہر امام شمارہ ۱۹۸۵ء ص ۲۹

؎۲ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۱

؎۳ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۴

"مر جائے اللہ کرے محبوبی مر جائے"۔ اماں اپنی لاڈلی
کو کوستے دیکھ کر خوب بگڑیں۔" [۱]

"اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابا لفافہ
سا بنا کر پیار میں اس کے سر پر مارا کرتے تھے۔" [۲]

"مانا روپیہ بھلی ہے اور لڑکی کو دکھانے کا فیشن
نہیں" [۳]

"محبت گو غریب سے ہوتی ہے مگر شادی تو امیر
ہی سے کرنی چاہیے نا بھئی۔" [۴]

عصمت چغتائی کی زبان میں کسی چشمے کی سی روانی ملتی ہے۔ جب وہ کسی بات یا کسی کیفیت کے اظہار پر آتی ہیں تو نہایت بے تکلفانہ انداز میں بے محابا لکھتی چلی جاتی ہیں۔ زبان ان کے لئے لوچدار گیلی مٹی کی حیثیت رکھتی ہے جسے وہ حسب منشا موڑتی توڑتی جاتی ہیں اور اسے جس شکل اور جس انداز میں چاہتی ہیں ڈھال لیتی ہیں۔ ان کا تخلیقی ذہن اس عمل میں ان کے مافی الضمیر کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ عصمت کی زبان کی سب سے پہلی پہچان اس کی بے ساختہ اور نادر تشبیہات ہیں۔ ان تشبیہات کے ذریعہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے دل کی بات بڑی آسانی اور سادگی کے ساتھ کہہ جاتی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ وہ شدت تاثر میں بھی خوشگوار اضافہ کرتی ہیں۔ دراصل ان کی نثر کی دلکشی اور رنگینی میں ان کی دلکش اور نادر تشبیہات کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

"اس نے پلا پیالہ کے ایک کونے میں اس کی نرم گرم
انا پکے آم کی طرح گول مٹول سی ہو رہی تھی۔" [۵]

۱۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۵
۲۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۱
۳۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۲
۴۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۴۲۹
۵۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۲

"مجھے اماں جیسے چونچلے تو آتے نہیں۔ وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچوں کو تخمی آم کی طرح ہر وقت چوما چاٹا کرتیں" [۱]

"مگر زمانہ سازگار نہ تھا۔ دوسرے دن جب عین اسی وقت اسی عبرت ناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھومتی ڈھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی۔" [۲]

"...... وہ ان بے پناہ شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لئے بہت مضمحل ہو جاتی مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس ابدی گناہ کے غار میں جا گرتی ہے" [۳]

"کٹ کٹ مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے اپنے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں یوں ہی جو سرے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچے زخم کی طرح ٹانکے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مزہ آیا جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے اتر رہی ہو، قاعدے کے ورق بکھر گئے" [۴]

"نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی۔ دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف ستھرا ہوا میٹھا پانی" [۵]

"وہ کھرے پلنگ پر پانی چھڑک کر پڑ رہی جسم میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہو جاتا۔ اچھو کی بخار سے جھلسی ہوئی آواز اس کے کانوں میں سانپ کی پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی" [۶]

۱۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۵۰

۲۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۶

۳۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۶

۴۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۳

۵۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۱۶

۶۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۱۴۹

"رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔" ؎۱

"شانوں پر جھولا جھول اس کی کمر کو اور بھی پتلا بنا دیتا اور اس کا کاسنی چنا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھوم جاتا تھا اور آنچل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر جھولا کرتا۔" ؎۲

"جیسے کسی نے اس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سن لی۔ اس کا دل غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا۔" ؎۳

تشبیہہ اور استعارے شاعر یا ادیب کے تخیل کی بلند پروازی کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ نادر تشبیہہ اور نایاب استعارے اگر نثر میں دیکھنا ہوں تو عصمت کے یہاں تلاش کیجئے۔

عصمت کا تخلیقی ذہن جب کسی تجربے یا واردات یا کیفیات کے اظہار پر آتا ہے تو بسا اوقات خوب و زشت میں بھی فرق نہیں کرتا۔ موقع اور محل کے اعتبار سے حسین اور دلکش تشبیہات کے ساتھ ساتھ ایسی تشبیہات بھی پیش کرتا چلا جاتا ہے جو نستعلیق مزاج رکھنے والوں کے دماغوں کو یقیناً گراں گزرتی ہوں گی۔ لیکن عصمت ان کی پرواہ نہیں کرتی ہیں ٹیڑھی لکیر میں پیش کردہ شمن کی زندگی بالخصوص اس کے بچپن سے متعلق معاملات میں عصمت چغتائی نے بڑی حد تک کریہہ، غلیظ اور ناگوار تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی جگہ نہایت غلیظ اور مکروہ تشبیہات سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے "پلے" کی طرح "بھینس کے کیڑے کی طرح" "غراتی بلی کی طرح" "مکڑی کی طرح" "سڑی ہوئی نالی کی طرح" "شیر کی طرح" "زخمی مینڈھکوں کی طرح" اور بھی اسی طرح کے جانور جو ہم آپ دیکھتے

؎۱	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۸۴
؎۲	ٹیڑھی لکیر	"	ص	۹۲
؎۳	ٹیڑھی لکیر	"	ص	۹۶

ہیں مگر ان کو اہمیت نہیں دیتے عصمت نے انہیں عزت بخشی ہے۔ عام طور سے لوگ اچھی اور خوشگوار چیزوں سے تشبیہہ دیتے ہیں مگر عصمت نے جس کثرت سے مکروہ اور غلیظ چیزوں کا استعمال کیا ہے اور خاص کر روزمرہ انسانی حرکات کا جانوروں کی حرکات سے تشبیہہ دینا ان کی فنکاری کا اچھا نمونہ مانا جا سکتا ہے۔ عصمت کی کچھ ایسی تشبیہیں دیکھیے جو انہوں نے جانوروں اور کیڑوں سے دی ہیں۔ ٹیڑھی لکیر میں شمن کی انّا کو اس کی عیاشی کی وجہ سے نکال دیا جاتا ہے اس کے بعد شمن کی بڑی بہن منجھو اسے پالنے لگتی ہے۔ شمن کو چونکہ انّا سے بہت لگاؤ تھا اور وہ بچہ بھی اس لئے منہ سے کہہ نہیں سکتی ہے مگر محسوس کرتی ہے اور بار بار انّا کی تلاش اپنے معصوم جذبات سے کرتی ہے۔ عصمت نے اس بات کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے

"یکایک ساری انّائیں کہیں غائب ہوگئیں۔ اس کا جی گھبرا گیا۔ ندیدی کتیا کی طرح سونگھ کر وہ انا کو ڈھونڈنے لگی" [۱]

"پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چمٹ جاتی اور پلّے کی طرح اس کے کپڑوں میں اپنی انّا کو ڈھونڈنے لگتی" [۲]

جانوروں سے تشبیہہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں وہ زور بھینس کے پڑے کی طرح ڈکراتی" [۳]

"چیل جیسی چوکنا آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر اونگھنے لگتیں" [۴]

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۲
۲ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۲
۳ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۶
۴ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۶

"جب سب اسے چھیڑنے کے لئے بھتنی بھتنی کہتے تو واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غرّاتی۔ بلّی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی۔" ۱؎

"منجھو تو دلہن بنی بیٹھی تھی اس لئے وہ بے نتھے بیل کی طرح گھومتی رہی" ۲؎

"پڑی پڑی وہ منجھو کے کمینے دولہا کو کوسا کرتی جو اسے چیل کی طرح جھپٹا مار کر چھین لے گیا" ۳؎

"مگر یہ ہیرا سی بیٹی اٹھتی جوانی میں رانڈ ہوگئی دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنہیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی" ۴؎

"جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہوگئیں مگر وہ الوؤں کی طرح بیٹھی رہی" ۵؎

"اس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں زخمی مینڈھکوں کی طرح پھول کر ابھر آئیں" ۶؎

عصمت نے جگہ جگہ نہ صرف چیتا، کبوتر، چیل، سانپ، مینڈک اور الّو سے تشبیہہ دی ہے بلکہ پھول، انڈے، تازہ گلاب، نئی شراب جیسے الفاظ کو نئے معنی میں خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی کا اسلوب اردو ادب میں حسین و دل کش اور تازہ کار اسلوب کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات کچھ ایسی ہیں کہ بظاہر سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس کی تقلید یا نقالی از حد دشوار ہے بلکہ بڑی حد تک ناممکن عمل محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں عصمت کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بقول مظہر امام

۱؎ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۷ — ۴؎ ٹیڑھی لکیر ص ۱۵۰
۲؎ ؍؍ ؍؍ ص ۲۶ — ۵؎ ؍؍ ؍؍ ۷۶
۳؎ ؍؍ ؍؍ ص ۳۰ — ۶؎ ؍؍ ؍؍ ۸۵

"ان کے (عصمت) افسانوں کے تار و پود میں توانائی
ان کے اس اسلوب سے آئی ہے جو اردو میں منفرد ہے اور جس کی نقل
کسی کے بس کا روگ نہیں۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو ــــــ
ہر ایک کے اسلوب کی نقل کی گئی ہے لیکن عصمت کے انداز بیان
اور زبان کی تقلید ممکن ہی نہیں۔" [۱]

مگر اس کے باوجود ایک بات قابلِ غور ہے ناول میں عصمت جس طبقہ کا ذکر کر رہی ہیں وہ طبقہ پھولوں باغوں اور نیچر سے کوسوں دور رہتا ہے۔ متوسط طبقہ روزی روٹی کمانے اور بچہ پیدا کرنے میں لگا رہتا ہے اور گھریلو ماحول میں انسان کا سابقہ جانور کیڑوں، مکوڑوں نالی اور شراب سے ہی پڑتا ہے۔ ان کی تشبیہات بھی اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اپنی زبان کے بارے میں خود عصمت کا دعویٰ ہے کہ وہ بناوٹی نہیں ہے جوں کا توں بات کہہ دینا عصمت کی وہ خوبی ہے جس کی نقل نہ کوئی کر سکا ہے نہ کر سکتا۔ ویسے کسی کی نقل مکمل طور سے کی بھی نہیں جا سکتی ہے۔ عصمت کا قول خود اپنی زبان کے بارے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

"اگر کہیں الفاظ میں بے ہودگی آجاتی ہے
تو اس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میں لکھتے وقت یہ نہیں سوچتی کہ یہ جملہ
فلاں شخص کے منہ سے نکلا ہے۔ وہ عام انسان کے سننے کے لائق
ہے کہ نہیں میں اس کو ویسے کا ویسا اپنے قلم سے لکھ دیتی ہوں کیونکہ
میں مصور نہیں ہوں فوٹو گرافر ہوں۔" [۲]

عصمت جیسا محسوس کرتی ہیں ویسا ہی بیان کرتی ہیں۔ اگر کسی خوب صورت لڑکی کا پیکر دیکھ کر انہیں مور کے انڈے یاد آتے ہیں تو وہ ویسا ہی لکھ دیتی ہیں۔

"اس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا۔ مور کے
انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال روشنائی" [۳]

۱۔ ماہنامہ الفاظ شمارہ ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۹ مظہر امام
۲۔ ماہنامہ شاعر شمارہ ۱۹۷۶ء ص ۱۴ یونس اگاسکر
۳۔ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۹۶

عصمت کے بیان میں جو لذت ہے اسے قاری اپنے ذہن میں محسوس کر لیتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں لذت کا بہاؤ اس روانی کے ساتھ ہے کہ قاری بہتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

"اب تو اسے بجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی
مگر قوتِ احساس اسے سب کچھ بتا دیتی تھی ... کہ اب بجمہ کدھر دیکھ
رہی ہے ..... اس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے
ہیں ..... آج اس نے صندل سنگھائی کے ریشم کا کرتا پہنا تو وہ ایسا
جسم پر چپک گیا ہے جیسے جسم پر صندلی وارنش چڑھا دی گئی ہو ...
آج اس کے چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے
تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھار
دار نوکیلے دانت، شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی
تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی [1]

ان کا ہر بیان تشبیہ اور استعارہ کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ عصمت کی تحریر پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساکت دریا میں ناؤ بڑے ہی پرسکون انداز سے بہی چلی جا رہی ہے اپنے آس پاس کی چیزوں کو غور سے دیکھتی محسوس کرتی اور سمجھتی ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے بے نیاز ہے مگر ہر چیز کی خبر رکھتے ہیں۔

"بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آ کر ایک اسکول
میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھیں۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح
پلک جھپکتے میں دوڑ گئی۔ کچھ یوں ہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ
ساس اس کے منہ پر بار بار حقارت سے اس گزرے ہوئے سانپ کا
تمسخر اڑاتی، وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے
کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اس لئے اس نے کٹھن زمانہ گزارنے کے لئے
میکے بھیج دیا تھا کہ کچھ تو باپ بھیّوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۹۵

رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عصر سمجھنے لگی تھی۔“ ۱ۓ

ڈاکٹر احسن فاروقی نے عصمت چغتائی کی زبان اور انداز بیان کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے

”ان کی زبان میں بناوٹ نام کو نہیں معلوم ہوتی وہ محض آنچل سنبھال کر قلم برداشتہ لکھتی جا رہی ہیں۔ مگر ان کا ہر فقرہ ہر جملہ ہر لفظ میں ایک برقی تیزی ہے جو پڑھنے والے کے دل کو ہلا دیتی ہے۔“ ۲ۓ

مجنوں گورکھپوری نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”ان کو خاص طبقہ کی روزمرہ کی زبان پر الہامی قدرت حاصل ہے۔ ایسی بے تکان زبان مشکل سے ہی کسی کو نصیب ہو۔ وہ الفاظ اور فقروں کے گویا طرارے بھرتی ہیں اور پڑھنے والا بعض اوقات ان کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔“ ۲ۓ

ڈاکٹر احسن فاروقی اور مجنوں گورکھپوری کی ان آرار سے اختلاف کرنا گویا کسی حقیقت کو جھٹلانے کے مصداق ہے کیوں کہ عصمت چغتائی کی زبان میں ایسا جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور اچھے اچھے زباندانوں سے اپنی زباندانی کا اعتراف کرا لیتا ہے۔

”نئے ادب کے معمار“ میں سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں

”عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کر دے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔“ ۳ۓ

گویا منٹو کے نزدیک عصمت چغتائی کی زبان ان کی فکر کی شدت اور رفتار کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ یہ بات کسی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر قاری کو ایسا محسوس

زبان / احسن فاروقی

زبان / مجنوں گورکھپوری

زبان / منٹو

۱ۓ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ ص ۲۴۲-۲۴۳

۲ۓ ادب اور زندگی مجنوں گورکھپوری ص ۲۳۶

۳ۓ نئے ادب کا معمار منٹو ص ۱۲

ہوتا ہے کہ عصمت کے تخلیقی ذہن کی توانائی اور ان کی فکر کی شدت اور رفتار کا ساتھ ان کی زبان نہیں دے پا رہی ہے لیکن اکثر مقامات پر وہ اپنی فکر کو نہایت کامیابی کے ساتھ الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔ عزیز احمد کا خیال ہے

"ان کے طرز تحریر میں نسوانیت ہے۔ یعنی وہ اس طرح لکھتی ہیں جیسے کوئی عورت اپنے نقطہ نظر سے لکھ رہی ہو۔ ذہنی طور پر مرد بنکر نہ لکھ رہی ہو۔ اسلوب میں عورت کی چلتی ہوئی زبان کی سی روانی ہے اور اس پر انگریزی تحریر کا جدت پسند اثر پڑا ہے"۔ [1]

کشن پرشاد کول اردو کے بزرگ قلم کار تھے۔ موصوف کا شمار باقاعدہ ناقدین میں تو نہیں کیا جاتا لیکن ان کی کتاب "نیا ادب" اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اردو فکشن میں اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں عصمت چغتائی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کشن پرشاد کول لکھتے ہیں۔۔

"عصمت چغتائی کے لکھنے کا ڈھنگ بڑا اچھا ہے، زبان اپنی ہے۔ انداز بیان کے کیا کہنے۔ حسن کاری کی جھلک ان کے افسانوں میں اکثر ایسی ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات افسانے میں ایسی کہہ دیتی ہیں جو یاد رہ جاتی ہے۔ چونکہ خود عورت ہیں، عورتوں سے متعلق جو کچھ لکھتی ہیں اس میں سچائی بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی"۔ [2]

کشن پرشاد کول اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے جو زبان کے متعلق ایک خاص مزاج اور رائے رکھتے تھے "لکھنے کا ڈھنگ بڑا اچھا ہے" سے ان کی مراد عصمت کے اسلوب بیان کی خوبی کا اعتراف کر "زبان اپنی ہے" کہہ کر انہوں نے زبان کے معاملے میں عصمت کی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عصمت زبان کے معاملے میں بے حد منفرد قلم کار ہیں۔ اور اس میدان میں کوئی دوسرا ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ معاصر ناقدین

۱۔ ترقی پسند ادب ۔ عزیز احمد ص

۲۔ ادبی اور قومی تذکرے کشن پرشاد کول ص ۴۸

میں آل احمد سرور بلند مقام رکھتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں آل احمد سرور اپنا جواب نہیں رکھتے لیکن عصمت کی تخلیقی زبان کا اعتراف انہوں نے بھی واضح لفظوں میں کیا ہے۔

"ان کے یہاں ڈرامائی کیفیت، قصہ پن، کردارنگاری مکالموں کی نفاست اور خوب صورتی نمایاں ہے۔ مگر انہوں نے جو گھریلو بامحاورہ جاندار اور رچی ہوئی زبان استعمال کی ہے اس کی جدید افسانوی ادب میں کوئی نظیر نہیں"۔ [۱]

عصمت کی تخلیقی زبان کی مثالیں ٹیڑھی لکیر کے کسی بھی صفحے سے دی جا سکتی ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ اپنا وزن اور حیثیت رکھتا ہے۔ ناول میں افسانے کا سا ایجاز و اختصار نہیں ہونا چاہئے۔ یہ عصمت خوب جانتی ہیں اور اپنے ناولوں میں اس کا خیال بھی رکھتی ہیں اور جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ ایجاز و اختصار سے بھی خوب کام لیتی ہیں۔ شمن ایک بار منجھو بی سے ناراض ہو کر کہتی ہے اللہ کرے منجھو بی کی شادی ہو جائے۔ اب عصمت کے قلم کا کمال دیکھئے

"دعا نہ جانے کیسے بڑے وقت سے نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑبڑ تھی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے گھر اتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو بی گھیر گھار کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھائیاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے۔ اچھا خاصا گھورا ٹ بن گیا۔
گھر کی عورتیں لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ ڈھول ڈھول باجے بجنے لگے"۔ [۲]

عصمت چغتائی کی تخلیقی نثر کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں جن میں کرداروں کے عادات و اطوار ان کی نفسیات اور جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ تنقیدی اشارے — آل احمد سرور — ص ۳۹
۲۔ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۵

نچلے طبقے کے کردار اور اعلیٰ طبقے کے کردار اور عالم و جاہل وغیرہ کی لفظیات میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ عصمت اسے کبھی نظر انداز نہیں کرتی ہیں۔

"اری رسولن اری رسولن کہاں مر گئی۔ مالزادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا نہیں لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں، مونگ کی دال اور ....
.... اور بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں ہاں شمن بی کے لئے، اور شکر کی گولیاں بھی ...... نائیں میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا .... [۱]

"چپ چڑیل، خبردار جو آواز نکالی۔ پاس کے پلنگ سے بڑی آپا غرائی۔ اوہ اب وہ سمجھ گئی! سوتے میں ظالموں نے اسے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا... ...... اے ہے چڑیل جان کو آگئی ہے اس کی، ادھر چل اگر اب کے پلنگ سے اٹھی تو بس کالی کوٹھری میں بند کر دوں گی۔ بڑی آپا نے گھسیٹ کر اس کی بانہہ پکڑی اور بھگاتی ہوئی لاکر پلنگ پر پٹخ گئی۔" [۲]

"بڑی آپا حیرت زدہ رہ گئی۔ اندھیر ہے کہ نہیں رانڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے حقدار کا خیال کریں گے۔ مگر فہمیدہ کو ثمینہ اور احمد نبی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اڑیں۔
ارے شمن عباس کے لئے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ ڈھاٹا بنی بیٹھی ہو۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔"
اے شمن خاک اتنا سوچیں گی .... نوری ؛ جاؤ تو ذرا میری بگلی

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۷
۲ " " ص ۳۷

کی انگیٹھی پر پانی گرم کر کے اوپر لئے جاؤ، بڑی آپا بولیں۔

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ دھلوا فخریہ عباس میاں کو لے کر اوپر سے اتر آئیں۔ سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔ [۱]

لے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ارے بھئی لوگوں کو تو بہت مل جائیں گے۔ یتیم کو جڑ جائے تو بہت جانوں۔ قرآن پاک میں بھی کہی لکھا ہے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق ــــ" [۲]

عورتوں کی زبان کے استعمال میں عصمت کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی تخلیقی نثر کا جوہر دراصل اسی زبان میں کھلتا ہے۔ معمولی معمولی باتوں، حرکتوں، جذبوں اور کیفیتوں کا اظہار وہ اتنی سادگی اور رواں انداز میں کرتی چلی جاتی ہیں کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر جن کے افسانوں کی زبان کو اردو کے تقریباً سبھی نقادوں نے سراہا ہے اور جنہیں وارث علوی جیسے منہ پھٹ نقاد نے اردو افسانے کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے عصمت چغتائی کے افسانوی مجموعے "چوٹیں" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"سیدھی سادی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر میں بولی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارہ شوخیاں اور چٹکیاں جو آپ ہی آپ اس نگار خانے میں خوب صورت گل بوٹے بناتی جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصورت معلوم ہوتی ہے" [۳]

پطرس بخاری جنہوں نے عصمت کے نفس موضوع پر کہیں کہیں سخت تنقید بھی کی ہے۔ ان

۱۔	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۱۵۶
۲۔	"	"	ص	۱۵۵
۳۔	چوٹیں کا دیباچہ	کرشن چندر	ص	۱۵

زبان کے مداح ہیں اور اس معاملے میں عصمت چغتائی کو اِن الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

" اردو میں مغربی تعلیمات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مصنفوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھیاں تو اکثر مل جاتی ہے۔ عصمت انگریزی کے خیر و شر دونوں سے مبرّہ ہیں یہ تو بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور اس پاکدامنی کی وجہ سے پیدا نہ ہو۔ بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردہ سے باہر نہ نکلے تھے اور جن کو اب انہوں نے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ادھر اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی ادھر خانہ نشیں الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس اور روانی ہے اور جملوں کا زیر و بم روزمرّہ کا سا چھریتیلا زیر و بم ہے اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا "[1]

پطرس بخاری کا یہ خیال بالکل درست ہے جو الفاظ اب تک پردہ میں تھے اب باہر کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور ان کو ایک نئی زندگی ملی ہے گھریلو ماحول اور زبان یوں تو اور خواتین قلم کاروں نے بھی استعمال کی ہے۔ مگر عصمت چغتائی کی بات ہی کچھ اور ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

" غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ چکے۔ کبھی ایک آگے تو کبھی دوسرا آگے یا جیسے انٹرویو ہو رہا ہے لوگ اپنی اپنی سی کر چکے ہیں۔ نتیجے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ بجی پیغام دے ہی نہیں چکتے اور نہ ہی منہ سے پھوٹتے ہیں۔ کھایا پیا اور پیر پسار کر سو گئے اور یہاں سب کی نیندیں حرام ہیں۔

---

[1] نقوش پطرس نمبر " کچھ عصمت کے بارے میں " ص ۲۶۰

معلوم ہوتا ہے ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر دولہا
اندر قدم نہیں رکھ چکتا،، ۱ے

"اے ہے نوج جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی
بے شرم ہوتیں توبہ ہے۔ گریبان تو دیکھو سارا آگا پیچھا کھلا پڑا ہے،
جب دیکھو جب ٹھٹی ٹھی جب دیکھو دھما چوکڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے،، ۲ے

"تو دیر تک شمن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی رہی
ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی
تھی جس نے مسز منجبر کو بد حواس کر رکھا تھا۔ اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر
ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بدصورت عورت میں انہیں کہاں سے
خطرہ نظر آ رہا تھا،، ۳ے

مجنوں گورکھپوری نے عصمت چغتائی کے فن کو اشاریت کا فن قرار دیا ہے اس کی ان گنت
مثالیں ٹیڑھی لکیر کے صفحات پر جا بجا بکھری پڑی ہیں۔

"...... مگر سیتل الو نہ تھا۔ اُسے کچے پھلوں سے نفرت تھی وہ
نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور پھل
کے پک کر رس دار ہو جانے کا انتظار کرتا۔ یہاں تک کہ خود اس کی آغوش
میں رس کی بارش ہو جاتی۔ مجبوراً وہ اسے چکھ لیتا بالکل زبردستی کی دعوت
سمجھ کر،، ۴ے

مگر محیط بھیا نہ جانے کن متعفن موریوں کی غلاظت

۱ے ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۱۵۶
۲ے " " ص ۲۴۹
۳ے " " ص ۲۷۹
۴ے " ص ۲۳۶

میں ہولی کھیل کر آئے تھے کہ اور زیادہ پردے کے حامی ہو گئے تھے، خاندان کی سب سے بے وقوف اور بے ہنگم لڑکی سے شادی طے کی اور شمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کر دیا،،[1]

"کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بے چارا زندگی میں زیادہ الّو بنتا ہے۔ یہ کولہو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے۔ ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے۔ لیکن یہ گائے! سوائے گھاس چبانے اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہے! ان کی بلا سے دودھ بھرنے نہ پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھالی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔۔۔
۔۔۔ اس کا اور بھی جی جل گیا۔۔۔ کمبختوں بیلوں میں بھی جان ہے،،[2]

یہاں عصمت نے گائے عورت اور بیل مرد تصور کیا ہے اور شادی کو تجارت سے کم نہیں۔ افتخار نے اسے ایک بار ملنے کے لئے بلایا۔ اس وقت اسے اپنے اندر نئی چمک محسوس ہو رہی تھی۔

"مگر آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سمنٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دبا دبایا کلہ سر اٹھا رہا تھا۔ مرجھائی ہوئی زور رو کونپل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی،،[3]

"ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اٹھے نہ گرجے نہ چمکے
بس برس ہی نکلے نہ جانے کب کے گھٹے ہوئے پرنالے بہہ نکلے،،[4]

۱؎	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۱۰۶
۲؎	"	"	ص	۲۵۳
۳؎	"	"	ص	۲۲۳
۴؎	"	"	ص	۴۲۱

" اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے
پیچ و تاب کھانے شروع کیے اور کنڈلی مار کر ایک بار ہی دوکان میں
گھسنے کی کوشش کی "۔ [۱]

" شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے
میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں
اوپر سے نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے "۔ [۲]

عصمت کی تحریر میں کہیں بھی تصنع محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی نثر میں پہاڑی چشمے کی سی روانی ہے جو اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزرتا ہوا اپنی راہ آپ بنا لیتا ہے اور اپنے اندر ایک فطری دلکشی رکھتا ہے عصمت کی زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں

" ان کی زبان کے متعلق تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتی۔ ان کو ایک خاص جوار اور ایک خاص طبقہ کی روزمرہ زبان پر الہامی قدرت حاصل ہے۔ ایسی بے تکان زبان مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے وہ الفاظ اور فقروں کے گویا طرارے بھرتی ہیں اور پڑھنے والا بعض اوقات ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ عصمت کا اسلوب بیان ایسا ہی ہے جیسے کوئی خواب میں بے اختیار بڑبڑا رہا ہو اور سننے والا جو نفسیات خواب کا ماہر نہ ہو اس کے بڑبڑانے میں بہت سی خلائیں اور بے ربطیاں محسوس کر رہا ہو۔ میں نے عصمت کے فن کو اشاریت سے تعبیر کیا ہے۔ وہ مربوط اور مسلسل طور پر کھل کر نہیں بتاتیں بلکہ بے ربط اور اچانک اشاروں سے بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔ ان کا سارا فن کچھ " لحافی " ہے جس کو سمجھنے کے لیے درک اور مہارت چاہیئے "۔ [۳]

۱	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۴۶۷
۲	"	"	ص	۲۹۴
۳	نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	ص	۳۲۲

مجموعی طور پر ٹیڑھی لکیر کی زبان ناول کی صحیح زبان ہے جس میں رنگینی بھی ہے غلاظت بھی، حسن بھی ہے اور قبیح بھی، سادگی بھی ہے اور پیچیدگی بھی، اس میں ترندگی اور توانائی ہے یہ زبان شاعری کی زبان سے واضح طور پر الگ ہے اور عصمت کی بے پناہ تخلیقی قوت کی مظہر ہے

ٹیڑھی لکیر میں فلسفۂ حیات

یہ دنیا بغیر مقصد پیدا نہیں ہوئی اور جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ مقصد و کام ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک ادیب کچھ تخلیق کرنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں بھی کوئی مقصد یا کوئی پیغام چھپا ہوتا ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنا نظریۂ حیات ہوتا ہے۔ وہ اگر اعلیٰ ہے تو یقیناً اس کا مقصد بھی اعلیٰ ہوگا۔ یہی بات ایک ادیب کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی ادیب بغیر سوچے سمجھے، بغیر کسی مقصد کے کچھ نہیں لکھتا۔ وہ فن کے پیرائے میں اپنے ارد گرد کی زندگی اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنا نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اردو ناولوں میں ابتدا ہی سے نظریۂ حیات کی پیش کش کے عموماً دو طریقے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ اس میں سے ایک طریقہ وہ ہے جس میں ناول نگار اپنے کرداروں کے عمل اور ردعمل کے ساتھ ہی جگہ جگہ اپنی طرف سے اس ضمن میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا جاتا ہے اور اس عمل یا ردعمل کی اچھائی کی تعریف اور برائی پر لعنت ملامت بھی کرتا جاتا ہے۔ یہ رویّہ نذیر احمد کے ناولوں میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ اس میں ناول نگار اپنے کرداروں کے عمل اور ردِعمل کی فنکارانہ عکاسی پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور اس سے اخذ ہونے والا نتیجہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار آزاد ہوتے ہیں اور ناول کا قاری بھی نتیجہ اخذ کرنے کے معاملے میں بالکل آزاد ہوتا ہے اور جلد یا تاخیر اپنی سمجھ بوجھ سے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس مخصوص نظریۂ حیات کو پا لیتا ہے جو مصنف کو مقصود ہے۔ یہ دوسرا طریقہ فنی لحاظ سے زیادہ مستحسن سمجھا جاتا ہے اور معروضی طریقہ کہلاتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناولوں میں نظریۂ حیات کی پیش کش کے ضمن میں مروجہ دونوں طریقے اردو ناول کے بالکل ابتدائی دور یعنی نذیر

احمد اور سرشار کے ناولوں سے لے کر دورِ حاضر تک کسی نہ کسی طور استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ہر اچھے ناول نگار کی تصنیفات میں اس کا نظریۂ حیات ضرور ابھرتا ہے۔ عصمت کے نظریۂ حیات کے بارے میں زرینہ عقیل لکھتی ہیں۔

"وہ اس دور کے سماجی نظام سے منفرد ہیں جہاں بیہودہ رسم و رواج اور توہمات کا دور دورہ ہے جہاں لذت اندوزی مذہبی جنون، فرقہ پرستی، جہالت اور غربت زندگی کا لازمی جزو ہے جہاں سرمایہ داروں کا تشدد عام ہے۔ لہٰذا وہ اس نظام کی بدصورتی کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ ایسا زبردست احتجاج کہ وہ مذہبی ریاکاری کا پردہ چاک کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ مولوی، قاضی، علما کسی کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ وہ خانقاہوں کی تاریکیوں اور مذہبی شعبدہ بازیوں کو سماجی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں۔" [۱]

عصمت نے زندگی کی ٹھوس حقیقت کو دیکھا سمجھا محسوس کیا اور اسے اپنے فن کے پردوں میں پیش کیا ہے وہ زندگی میں صرف خواب ہی نہیں دیکھتیں بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے اور اگر کچھ ہوتا ہے تو کیوں ہو رہا ہے اس بات پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" کا سنہ اشاعت ۱۹۴۶ء ہے [۲] یہ وہ دور ہے جب ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ ہر طرف تعلیم کا دور دورہ تھا تعلیم نسواں پر بھی بہت زور دیا جارہا تھا۔ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بیدار ہو چکا تھا۔ انگریز حکمراں یہ بات سمجھ چکے تھے کہ اب ان کی حکومت بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اس لئے وہ جاتے جاتے ہندوستانیوں کے آپسی اختلافات کو بڑھاتے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔

اِدھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے پرچم تلے لکھنے والے نوجوان شاعر و ادیب، غلامی

۱۔ اردو ناول میں سوشلزم زرینہ عقیل ص ۴۴۸

۲۔ الفاظ کراچی شمارہ ۱۹۸۵ میں ص ۱۲ ٹیڑھی لکیر کی اشاعت ۱۹۴۶ء

اردو ناول بیسویں صدی میں۔ عبدالسلام نے ٹیڑھی لکیر کی اشاعت ۱۹۴۵ لکھی ہے

سماجی نابرابری، استحصال اور سماج کے بوسیدہ رسم و رواج سے بغاوت کرنے کے لئے لوگوں کو اکسا رہے تھے۔ عصمت نے ایسے ماحول میں یہ ناول لکھا تھا۔ چونکہ عصمت کا تعلق بھی ترقی پسند تحریک سے ہے اس لئے ان کا رویہ حقیقت پسندانہ رہا ہے۔ عصمت نے اپنے ناول ٹیڑھی لکیر میں شروع سے ہی حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

فلسفہ حیات کے بغیر ناول ادھورا اور بے روح سمجھا جاتا ہے۔ ادیب فلسفہ حیات سے ناول میں معنویت پیدا کرتا ہے۔ ناول کے کرداروں کے عمل اور ردِّ عمل سے مصنف کے نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے وہ اپنے کرداروں کو کبھی تو ہمدردانہ انداز میں پیش کرتا ہے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور بعض کرداروں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا بلکہ کہیں کہیں تو ان کے ساتھ نفرت کا برملا اظہار کرتا ہے۔ کہیں وہ شوخیانہ اشاروں سے کام لیتا ہے اور کہیں طنز کے حربے آزماتا ہے۔ پھر بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے ساتھ ساتھ ان میں پیدا ہونے والی خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیوں کی عکاسی بھی کرتا ہے بقول احسن فاروقی

> "فلسفہ حیات کی بھی ناول میں کافی اہمیت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار کوئی فلسفہ یا اخلاقی سبق اپنے ناول کے ذریعہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہو مگر چونکہ ناول نگار کا مطمح نظر زندگی کو پیش کرنا ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی اس کے عام اخلاقی و فلسفی و مذہبی وغیرہ خیالات کی حامل نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ناول کے قصے میں کوئی خاص نظریہ مضمر نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض چیزوں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ناول میں ہم کو فلسفہ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول ایک فلسفۂ حیات کا عکس پیش کرتا ہے خواہ وہ عکس کتنا دھندلا کیوں نہ ہو زندگی کے کچھ پہلوؤں کو روشن کرتا ہے اور بعض پہلوؤں کو کچھ تاریکی میں ڈال دیتا ہو

روسی ناول خاص طور پر پیامی ہیں۔ ان میں حقیقت کا انکشاف
اسی صورت سے ہوتا ہے ہمارے قلوب انکسار، رحم اور محبت
سے بھر جاتے ہیں۔ ان میں کسی خاص قسم کے اخلاق پر وعظ نہیں
ہیں مگر ان کا اخلاق ہمارے دل میں جگہ کرتا ہے۔" ۱؎

ٹیڑھی لکیر میں بھی کرداروں کے عمل ردعمل اور مکالموں کے ذریعہ عصمت نے اپنے نظریۂ حیات کا اظہار کیا ہے۔ وہ سماج کے رسم و رواج پر طنز کرتی ہیں۔ کبھی ہمارے سماج میں عورت کی غیر اطمینان بخش حالت پر تبصرہ کرتی ہیں۔ اس ناول میں ان کے خیالات جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں جنہیں یکجا کرنے کے بعد ہی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ مسلم سماج میں عورت کو پردے میں رہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور اس کی ہزاروں وجوہات بتائی گئی ہیں۔ مگر عصمت کی نظر جہاں تک پہنچتی ہے وہ ان مذہبی احکامات کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی قدر و قیمت معلوم کرتی ہیں۔ شمن آزادی کی قدر دان ہے۔ عورت کی آزادی کی علم بردار ہے لیکن جب وہ بے پردگی کی آزاد زندگی کے مضرت رساں نتائج پر غور کرتی ہے تو محسوس کرتی ہے کہ اس آزادی سے تو پردے کی قید ہی زیادہ مفید شے ہے۔

"شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی تو قید ہے ٹھیک کہتے ہیں یہ
بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردہ میں رہنا چاہئے۔ سچ تو ہے کتنے مزے
سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے۔ جی چاہا جس سے چھپ گئے اور
جی چاہا جسے دکھایا۔ بدصورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہونگی۔ جسے ہلکی
سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں
اور ہر عیب سامنے دکھا دل دکھا رہا ہے" ۲؎

عصمت نے عورت کے پردہ فیشن ان کی مکاریوں، عورت کی محبت اور نفرت

۱؎ ناول کیا ہے — احسن فاروقی — ص ۴۵-۴۶
۲؎ ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ص ۲۵۰

کو جس بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا جواب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ عصمت نے عورت ہوتے ہوئے عورت کی کمزوریوں کا پردہ فاش کیا ہے اور جس بے باکی سے عورت کے مسائل و معاملات کو بیان کیا ہے یہ کام صرف عورت بلکہ ایک حساس عورت ہی کر سکتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے عورت کی زندگی کے مقصد پر غور و خوض کرتے ہوئے نہایت بے باکی کے ساتھ یہ سوال اٹھانے کی سعی کی ہے کہ کیا عورت کا وجود بھی اشیائے خورد و نوش کی طرح صرف مرد کے استعمال کی شے ہے یا اس کے علاوہ بھی اس کے کچھ معنی ہیں؟

"نوری خواب بیداری سے جی بھر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سر اپنے بازو سے نہ ہٹایا۔ اس کا نرم گرم جسم، خوابوں سے رنگین چہرہ، ابٹنے میں بسے ہوئے میلے کپڑے، وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ عورت! کیا ہی تھی۔ عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔ اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائیگا کہ اگر تھوڑی بساند بھی ہو تو معلوم نہ پڑے۔ ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سا مسالہ چھڑک دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح دلہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولہا کے حلق میں اُتار دیا جائے گا۔" ؎

مسلم معاشرے میں شادی کے سلسلے میں مہر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ شادی بغیر مہر کے ادھوری اور نامکمل ہے۔ مہر کی رقم شادی کے لئے کیوں رکھی گئی ہے اس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ مگر عصمت کا خیال ان سبھی سے الگ تھلگ عجیب و غریب اور قابل غور ہے۔

مہر کی رقم

"اسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بے وقوفوں کی طرح نہیں۔ پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو اور

؎ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۳۹

پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے اور وہ چند بھی ڈھول تاشے سے اسے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچالو، پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک فریق خیانت نہ کرے۔ بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا پھٹ .... یہی نوری۔ یہ کم عمر الھڑ لڑکی اس کی ہستی میں ایسے گہرے پنجے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اس کے ہاتھ میں لگام دے کر اسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ حیف ہے کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ مگر یہ جوتی ان کے سر پر بجتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو سکتا ہے۔ اسے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے میں لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو ان کی کمائی پر بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر وہ اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں .... بجائے درجنوں کے صرف ایک سے .... پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں شاید اس طرح خود ان کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو "پرجا کا چاکر" بن کر انہیں الّو بناتی ہے۔ اس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پراسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔" [1]

عورت مرد کے ازدواجی تعلقات کی بابت اس انداز میں غور و فکر ہمیں عصمت کی ٹیڑھی لکیر

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۵۲ - ۲۵۳

سے پہلے کسی اور ناول میں نہیں ملتا۔ وہ شادی اور اس سے پیدا ہونے والے تمام مسائل سے پوری طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ انہیں بظاہر مظلوم نظر آنے والی عورت کی تمام کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت اور اس کے اس ظالمانہ سلوک کا بھی صحیح صحیح اندازہ ہے۔ جو عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ عصمت کی تیز نظر میں بظاہر سخت اور ظالم نظر آنے والے مردوں کی کمزوریاں ان کی نرمی اور ان کی ناعاقبت اندیشی کا جائزہ لئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس اقتباس میں انہوں نے جس بے لاگ انداز میں جرأت مندی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف ان کا خاصہ ہے۔ عورت کی کمزوریوں کا اس کی چھپی ہوئی خواہشوں کا بیان عصمت نے اس طرح سے کھل کر کیا ہے کہ کبھی کبھی غصہ بھی آتا ہے کہ یہ سچائی جو پردے میں تھی صنف نازک کی وراثت تھی۔ عصمت نے سب کے سامنے کیوں پیش کردی۔ یہاں "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" والی کہاوت صادق آتی ہے۔ عصمت نے جرأت مندی سے اس کا اظہار کیا ہے۔ مرد ادیبوں نے عورتوں کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ عصمت کے بیان کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے جہاں تک عصمت پہنچی ہیں اور کامیاب ہوئی ہیں۔ شاید اس کی وجہ عصمت کا عورت ہونا بھی ہو۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہر پڑھا لکھا نوجوان ترقی پسند گروہ میں شامل ہونے کا خواہاں تھا اور موڈرن کہلانے میں عزت محسوس کرتا تھا۔ ترقی پسند تحریک ایک وبا کی طرح پھیل رہی تھی۔ ہر انسان جو اپنی سوچ میں تھوڑا بہت جدید یا بغاوت پسند خود کو ترقی پسند کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ عصمت نے ترقی پسندوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں ان پر تنقید بھی کی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس میں پسندی اور نشو کا ذکر بھی موجود ہے۔ ناول کا یہ حصہ نوجوان ترقی پسندوں کی خوش فہمیوں پر ایک گہری چوٹ ہے۔ عصمت خود بھی ترقی پسند ہیں اور آج بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس لیئے ان کے بیان کو دیانت دارانہ محاسبے سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔ اس کے ذریعے وہ محض اتنا واضح کرنا چاہتی ہیں کہ زندگی میں خواب اور حقائق دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور زندگی کے دھارے کو کسی خاص منصوبے کے تحت یکسر بدلنا از حد دشوار

بلکہ ناممکن بات ہے۔

" ترقی پسند گروہ کی ہر میٹنگ زیادہ دل چسپ ہوتی گئی جتنے ممبر تھے سب ہی ہتھیلی پر جان رکھے کام آکو تیار رہتے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی رحمان اپنی چچازاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اسے صرف اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا۔ اسی طرح ایک شاعر تھے انور جو عشق میں ناکامیاب ہو چکے تھے۔ ان کی شاعری انقلابی ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب انقلاب آنے ہی والا ہے۔ یہ شاعر سماج میں طبقاتی رشتوں کو ختم کرنا چاہتا تھا اور ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا جس میں اس کی محبوبہ اسے مل سکتی۔ بس یہ اسی ایک مصرف کے لئے ترقی پسندی کے قائل تھے کہ جو جس سے چاہے شادی کرے۔"

اور جب ایسا نظام آئے گا تو بقول عصمت

" اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر پتہ نہیں کیا ہوگا۔" [1]

ترقی پسند گروہ میں جتنے لوگ تھے ان کے ساتھ ان کی داستانیں وابستہ تھیں۔ وہ بھی ترقی پسند اس لئے نہیں ہوتے تھے کہ وہ سماج میں سدھار لانے کے خواہش مند تھے بلکہ

---

[1] ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۶۲ - ۲۶۳

وہ اپنے اور صرف اپنے لئے ہی آزادی چاہتے تھے اپنا فائدہ چاہتے تھے اس سچائی کو عصمت نے ترقی پسند گروہ میں رہ کر جانا اس قسم کے لوگ ہی ترقی پسند بنتے تھے اور یہی لوگ اس تحریک کو بدنام کر رہے تھے۔ اسی طرح کے ایک اور کارکن کا ذکر عصمت یوں کرتی ہیں۔

"اس کے علاوہ وہ آنند تھا جس پر شہر کی کل طوائفیں عاشق تھیں وہ ان کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر فن کار کے لئے ضروری ہوتی ہے اور وہ ایک سچا فن کار تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے بعد وہ طبع زاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بلند مرتبہ مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا" ؎۱

اس بیان میں روئے سخن کس کی طرف ہے یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے۔ عصمت نے اس بیان میں اسی طرح چند اور ہم عصروں کے بھی کامیاب خاکے اڑائے ہیں۔

"برکت عجیب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم۔ اے کر رہا تھا مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ لارنس تو اس کے رومانی دیوتا تھے۔ جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا اور جنسی آزادی کو سماج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا" ؎۲

عصمت کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ وہ ان چیزوں کو مستحسن نہیں سمجھتی ہیں بلکہ ان کی مضحکہ خیزی کو اور بھی اجاگر کرتی ہیں کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ فن میں حقیقی زندگی کی پیش کش محض کتابی مطالعے کے بل پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے حقیقی زندگی اور اس

؎۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۶۲

؎۲ " " ص ۲۶۳

کے نشیب و فراز اور اسرار و رموز کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے اور یہ چیز کتابیں نہیں سکھاتیں بلکہ زندگی کے سچے تجربے ہی سکھاتے ہیں۔

بچوں کی نفسیات

بچوں کے متعلق عصمت کا نظریہ صاف اور ظاہر ہے۔ شمن کی پرورش جس ماحول میں جس طریقہ سے ہوئی ہے وہ غلط ہے۔ عصمت نے قریب ۸۵ - ۸۶ صفحات تک بچوں کی نفسیات، بچوں کی عادات، بچوں کی خواہشات اور بچوں کی پرورش کا بیان سچائی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ عصمت کا گہرا مشاہدہ ہی تھا جو وہ اس قدر سچائی سے ان سب کا بیان کر گئیں۔ انہوں نے بچوں کی نفسیات پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن شمن کا بار بار بھٹک جانا، غلط عادتوں کا اپنانا اور چاہت کی خواہش کی تکمیل کے لئے "بزرگ رائے صاحب" تک سے محبت کا اظہار کر بیٹھنا اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے وقت کی گئی لاپرواہیوں کی طرف واضح اشارہ ہے شمن کے متعلق تمام باتیں باریکی اور تفصیل سے بیان کر کے عصمت یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط باتیں اور غلط رویّے کس حد تک خطرناک ہو سکتے ہیں عصمت نے بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت میں لاپرواہی برتنے کا ایک غلط نظریہ پیش کر کے صحیح راستے کی تلاش کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے اور فکر و عمل کی دعوت دے۔ عصمت اس مقصد میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

عصمت نے مذہب اور خدا کو بھی نہیں بخشا۔ وہ مذہب کے روایتی کردار سے بھی نالاں ہیں۔

"شمن نہ جانے کیسے میری آرزو ہے۔ میں کسی سے محبت کروں
مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا
ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے ؟
اس کی کیا ضرورت ہے ؟ مانا کہ یہ دنیا اس نے بنائی تو ہم پر کیا احسان
کیا۔ اسے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے اور جو نہ کرو تو دوزخ
میں جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبڑی بھنگی دنیا

تمہیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ،
پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر
خشکی ہے تو وہ کم بخت بے تکی جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو
دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سبک اور نفیس دنیا بناؤں
کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں"۔ ؎۱

اس ناول میں عصمت نے لکچر نہیں دیا، اصلاح نہیں کی صحیح راستہ نہیں دکھایا بلکہ طنز کیا ہے مذاق اڑایا ہے اور اکثر مقامات پر انتہائی سنجیدگی کا رویہ اختیار کیا ہے اور اس طور پر قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی ان کی خوبی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر دھند میں کھوئی ہوئی کوئی مبہم تصویر نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں سے بھرپور واضح نظریہ حیات سے پُر ایک تصنیف ہے جو مدتوں یاد رکھی جائے گی۔

---

۱ ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی ص ۲۹۵

عصمت چغتائی کی تصنیفات کی فہرست

ناول اور ناولٹ

۱۔ ضدی	(ناولٹ)	۴۱-۱۹۴۰ء
۲۔ ٹیڑھی لکیر	(ناول)	۱۹۴۴ء
۳۔ معصومہ	(ناول)	۱۹۶۲ء
۴۔ سودائی	(ناولٹ)	۱۹۶۴ء
۵۔ جنگلی کبوتر	(ناولٹ)	۱۹۶۸ء
۶۔ دل کی دنیا	(ناولٹ)	
۷۔ عجیب آدمی	(ناولٹ	
۸۔ ایک قطرہ خون	(ناول)	۱۹۷۰ء
۹۔ باندی	(ناولٹ)	
۱۰۔ نقلی راجکمار	(بچوں کا ناول)	
۱۱۔ تین اناڑی	(بچوں کا ناول)	

رپورتاژ

۱۔ بمبئی سے بھوپال تک

مضامین

۱۔ پوم پوم ڈارلنگ
۲۔ کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے۔
۳۔ کہانی
۴۔ کدھر جائیں
۵۔ بیچاری عورت
۶۔ بنے بھائی

۷۔ لال چیونٹے
۸۔ ایک بات
۹۔ ہیروئن

چوٹیں (افسانوی مجموعہ)

✓ ۱۔ بھول بھلیاں
۲۔ پنکچر
✓ ۳۔ ساس
۴۔ سفر میں
۵۔ اس کے خواب
۶۔ جنازے
۷۔ لحاف
۸۔ بیمار
۹۔ میرا بچہ
۱۰۔ تل
۱۱۔ چھوٹی آپا
۱۲۔ جھری میں سے
۱۳۔ ایک شوہر کی خاطر
۱۴۔ دوزخی
۱۵۔ عورت اور مرد (ڈرامہ)

ایک بات (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام سنہ ۱۹۴۲ء

۱- ننھی سی جان
۲- نفرت
۳- جال
۴- ہیرو
۵- بیڑیاں
۶- پسینہ
۷- باورچی
۸- ایک شوہر کی خاطر
۹- چوتھی کا جوڑا
۱۰- ایک بات (مضمون)
۱۱- لال چیونٹے (مضمون)
۱۲- ہیروئن (مضمون)

بدن کی خوشبو (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام سنہ ۱۹۷۹ء

۱- بدن کی خوشبو
۲- چارپائی
۳- گھونگھٹ
۴- ہندوستان چھوڑ دو
۵- روشن
۶- خدمت گار
۷- کارساز

چھوئی موئی (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام سنہ ۱۹۵۲ء

۱۔ بہو بیٹیاں
۲۔ کیڈل کورٹ
۳۔ سونے کا انڈا
۴۔ چھوئی موئی

دو ہاتھ (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام سنہ ۱۹۵۵ء

۱۔ دو ہاتھ
۲۔ یار
۳۔ بے کار
۴۔ بچھو پھوپی
۵۔ کلّو کی ماں
۶۔ نیند
۷۔ کنواری
۸۔ چٹّان
۹۔ چوتھی کا جوڑا
۱۰ عشق پر زور نہیں

کلیاں ، افسانوں اور ڈراموں کے نام

۱۔ پردے کے پیچھے
۲۔ گیندا
۳۔ شادی
۴۔ انتخاب (ڈرامہ)

۵۔ جوانی
۶۔ ڈائن
۷۔ سانپ (ڈرامہ)
۸۔ فسادی (ڈرامہ)
۹۔ ڈھیٹ (ڈرامہ۔ مکالماتی)
۱۰۔ خدمت گار
۱۱۔ بچپن (مضمون)
۱۲۔ تاریکی
۱۳۔ کافر
۱۴۔ نیرا
۱۵۔ اُف یہ بچے

ڈرامے

۱۔ عورت اور مرد
۲۔ فسادی
۳۔ سانپ
۴۔ پردے کے پیچھے سے
۵۔ انتخاب
۶۔ بنّے
۷۔ ڈھیٹ

شیطان

۱۔ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ

کتابیات

کتاب کا نام	مصنف	ناشر	سن اشاعت
۱۔ اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	الحمرا پبلیشرز دہلی	بار اول ۱۹۷۲
۲۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	النبرین بکڈپو لکھنؤ	۱۹۵۰
۳۔ اردو ناول آزادی کے بعد	ڈاکٹر اسلم آزاد	نکھار پبلیشرز مئوناتھ بھنجن (یوپی)	طبع اول ۱۹۸۱
۴۔ اردو ناول میں سوشلزم	زرینہ عقیل احمد	کتابستان الہ آباد	اول ۱۹۸۲
۵۔ ادب اور نفسیات	دیویندر اسّر	مکتبہ شاہراہ دہلی	پہلی بار اپریل ۱۹۶۳
۶۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	ادارۂ فروغ اردو امین آباد لکھنؤ	تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۱
۷۔ اردو ادب کی ایک صدی	سید عبداللہ	چمن بکڈپو اردو بازار دہلی	
۸۔ اردو ناول کا نگار خانہ	کے کے کھلر	سیمانت پرکاشن دہلی	۱۹۸۳
۹۔ ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	بار دہم بعد ترمیم فروری ۱۹۸۰
۱۰۔ ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	اردو گھر علی گڈھ	۱۹۶۵
۱۱۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۱
۱۲۔ انداز نظر	صفیہ اختر	علوی بکڈپو محمد علی روڈ بمبئی	۱۹۶۰
۱۳۔ اردو ناول بیسویں صدی میں	پروفیسر عبدالسلام	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	بار اول اکتوبر ۱۹۷۳
۱۴۔ اردو ناول پریم چند کے بعد	ہارون ایوب	لکھنؤ	بار اول ۱۹۷۸
۱۵۔ بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست	حیدرآباد	بار اول ۱۹۶۹
۱۶۔ پریم چند کی ناول نگاری	ڈاکٹر یوسف سرمست	خورشید پریس چھتہ بازار	بار دوم ۱۹۸۶
۱۷۔ پریم چند کے نسوانی کردار	شمیم نکہت	بہ اشتراک یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ	اوّل ۱۹۷۵
۱۸۔ ترقی پسند ادب ایک جائزہ	ہنسراج رہبر	آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔	بار اول ۱۹۶۷
۱۹۔ ترقی پسند ادب	سردار جعفری	انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ	بار اول ۱۹۵۱
۲۰۔ تلاش توازن	قمر رئیس	ادارۂ مخزن پبلیشرز حوض قاضی دہلی	اول ۱۹۶۸

۲۱۔ تنقیدی اشارے — آل احمد سرور — ادارۂ فروغ اردو مجبر۔ امین آباد پارک لکھنؤ
۲۲۔ ترقی پسند ادب — عزیز احمد — عارف پبلشنگ ہاؤس کلاں محل دہلی۔ — بار اول ۱۹۴۵
۲۳۔ تحلیل نفسی کے پیچ وخم — ڈاکٹر سلامت اللہ — مکتبہ جامعہ نئی دہلی — پہلی بار ۱۹۸۲
۲۴۔ تنقیدی زاویے — ڈاکٹر عزیز احمد — شاہین بک اسٹال سری نگر کشمیر — باراول ۱۹۶۰
۲۵۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ — ڈاکٹر صادق — اردو مجلس، ۷۷ بازار چتلی دہلی۔ — ۱۹۸۱
۲۶۔ تنقید کیا ہے — پروفیسر آل احمد سرور — جمال پرنٹنگ پریس دہلی — ۱۹۷۲
۲۷۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر — قمر رئیس — نیا سفر پبلیکیشنز۔ نئی دہلی — ۱۹۸۸
۲۸۔ تنقیدی مطالعے — ڈاکٹر شارب ردولوی — نصرت پبلیشرز حیدری مارکیٹ لکھنؤ
۲۹۔ جنس کا نفسیاتی پہلو — سید قاسم — مکتبہ جدید لاہور — باراول ۱۹۶۱
۳۰۔ داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — سلطانیہ بکڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔ — ۱۹۶۶
۳۱۔ رتن ناتھ سرشار — ڈاکٹر قمر رئیس — ساہتیہ اکادمی — باراول ۱۹۸۳
۳۳۔ شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا — جنید احمد — جنید احمد بک ہاؤس، بمبئی
۳۴۔ کردار اور کردار نگاری — ڈاکٹر نجم الہدیٰ — شمشاد اختر ۱۷، سیکنڈ فلور میر بخش علی اسٹریٹ مدراس — ۱۹۸۰
۳۵۔ کردار — صفی مرتضیٰ — نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
۳۶۔ ڈکشنری آف سائیکالوجی — جیمس ڈروِن — پن گوئن بک — ۱۹۶۸

۳۷۔ مرزا رسوا	آدم شیخ	نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ	اول ۱۹۶۸
۳۸۔ نذیر احمد شخصیت اور کارنامہ	ڈاکٹر اشفاق احمد	مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار دہلی	اول ۱۹۷۴
۳۹۔ ناول کیا ہے	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ	چھٹا ایڈیشن ۱۹۸۳
۴۰۔ ناول کا فن	ترجمہ ابو الکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	باراول ۱۹۷۸
۴۱۔ نیا ادب	کشن پرشاد کول	کتابستان اسرار کریمی پریس الہ آباد	مارچ ۱۹۴۹
۴۲۔ نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	کتابستان اسرار کریمی پریس الہ آباد	اکتوبر ۱۹۵۷
۴۳۔ نئے ادب میں عورت	ہنس راج رہبر	آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی	باراول ۱۹۶۷
۴۴۔ نئے ادب کے معمار	سعادت حسن منٹو		
۴۵۔ ہم اور ہماری نفسیات	مرتضیٰ شفیع	بمبئی ایجوکیشنل بک ڈپو اسکول روڈ حیدر آباد	۱۹۴۸
۴۶۔ ایک قطرہ خون	عصمت چغتائی	فن اور فن کار ۴۹۔ محمد علی روڈ بمبئی	۱۹۷۵
۴۷۔ ٹیڑھی لکیر	عصمت شاہد لطیف	کتاب کار، رام پور۔ مئی	۱۹۴۴
۴۸۔ جنگلی کبوتر	عصمت چغتائی	———	
۴۹۔ دل کی دنیا	عصمت چغتائی	———	۱۹۶۸
۵۰۔ سودائی	عصمت چغتائی	———	۱۹۶۴
۵۱۔ ضدی	عصمت چغتائی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	۱۹۸۲
۵۲۔ عجیب آدمی	عصمت چغتائی	صفیہ پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی	
۵۳۔ معصومہ	عصمت چغتائی	اسٹار پبلیکیشنز دریا گنج دہلی	۱۹۶۲

رسالے

۱۔ ادبی دنیا ماہنامہ جنوری سنہ ۱۹۴۵ء لاہور
۲۔ ادبی دنیا ماہنامہ فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۰ء لاہور
۳۔ بیسویں صدی مارچ سنہ ۱۹۴۷ء
۴۔ بیسویں صدی
۵۔ ساقی ماہنامہ سالنامہ سنہ ۱۹۳۸ء
۶۔ ساقی ماہنامہ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء
۷۔ ساقی ماہنامہ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء
۸۔ ساقی ماہنامہ فروری سنہ ۱۹۶۵ء
۹۔ شب خون مارچ سنہ ۱۹۶۷ء
۱۰۔ شب خون اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء
۱۱۔ کتاب ستمبر سنہ ۱۹۶۳ء لکھنو
۱۲۔ آج کل ماہنامہ سنہ ۱۹۶۶ء دہلی
۱۳۔ ادب لطیف ماہنامہ سنہ ۱۹۴۱ء لاہور
۱۴۔ ادب لطیف ماہنامہ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء لاہور
۱۵۔ ادیب ماہنامہ جون سنہ ۱۹۴۲ء دہلی
۱۶۔ کتاب ماہنامہ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء
۱۷۔ کتاب ماہنامہ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء
۱۸۔ کتاب ماہنامہ مئی سنہ ۱۹۶۵ء
۱۹۔ مخزن اہنامہ ستمبر سنہ ۱۹۰۷ء
۲۰۔ نگار اپریل سنہ ۱۹۴۹ء
۲۱۔ نگار دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء
۲۲۔ نقوش سنہ ۱۹۵۹ء

رسالے

نمبر	رسالہ				
۲۳-	نگار	ماہنامہ	اکتوبر	۱۹۳۰ء	
۲۴-	نگار	ماہنامہ	دسمبر	۱۹۵۰ء	
۲۵-	نقوش			۱۹۵۴ء	افسانہ نمبر
۲۶-	نقوش				شخصیت نمبر
۲۷-	نقوش				ادب عالیہ نمبر
۲۸-	نقوش				مکاتیب نمبر
۲۹-	نیا دور	ماہنامہ	شمارہ	۳۳-۳۴	کراچی
۳۰-	نیرنگ خیال		اپریل	۱۹۳۴ء	لاہور
۳۱-	نیرنگ خیال		دسمبر	۱۹۳۴ء	لاہور
۳۲-	نیرنگ خیال		جون	۱۹۴۳ء	لاہور